فہرست مضمون نگارانِ معارف

جلد ۸۱

جنوری ۱۹۵۸ء تا جون ۱۹۵۸ء

(بہ ترتیب حروفِ تہجی)

فہرست مضامین معارف

جلد ۸۱

جنوری ۱۹۵۸ء تا جون ۱۹۵۸ء

(بترتیب حروف تہجی)

جلد ۸۱ ماہ جمادی الثانی ۱۳۷۷ھ مطابق ماہ جنوری ۱۹۵۸ء نمبر ۱

مضامین

اعلان

جن خریداران معارف کے پتے چٹوں پر غلط چھپ گئے ہیں، براہ کرم وہ اپنا صحیح اور مستقل پتہ انگریزی اور اُردو میں صاف صاف تحریر فرما کر بھیجدیں تاکہ نئے رجسٹر میں ان کی تصحیح کرلی جائے۔

منیجر

بسم اللہ الرحمن الرحیم

شذرات

شیخ الہند حضرت مولانا حسین احمد صاحب مدنی کی وفات ملک و ملت کا اتنا بڑا حادثہ ہے کہ اس پر اظہار غم سے قلم قاصر ہے، یہ تنہا ایک شخص کی موت نہیں بلکہ صحیح معنوں میں موت العالِم، موت العالَم ہے،

وما کان قیس ھلکہ ھلک واحد ولکنہ بنیان قوم تھدما

علم و عمل، دین و تقویٰ، سلوک و تصوف، ارشاد و ہدایت، جہاد و جانبازی، خلق عظیم و لطف عمیم، کس کس چیز کا ماتم کیا جائے، وہ اس دور میں سلف صالحین کا نمونہ اور اسلام کی مجسم تصویر تھے، ان کی ایک ایک ادا سے اسوۂ صحابہ آشکارا تھا، دین کے متفرق جلوے اس دور کے اور بھی صلحاء و اخیار میں ہوں گے، مگر ان کی ذات "آنچہ خوباں ہمہ دارند تو تنہا داری" کی مصداق تھی، اور ان پر اس جامعیت کا خاتمہ ہو گیا، وہ سراپا عمل، سراپا جہاد اور ہمارے پرانے کاروانِ ملت کے آخری مسافر تھے، ان پر اس سلسلۃ الذہب کی خصوصیات ختم ہو گئیں جس کا آغاز خاندانِ ولی اللہی سے ہوا تھا، اس نازک دور میں ایسی ہستیوں کا اٹھ جانا ملک و ملت کی بڑی بدنصیبی اور اسلام کی غربت اور بے کسی کی نشانی ہے، ایسے نفوس قدسیہ مدتوں میں پیدا ہوتے ہیں، اللہ تعالیٰ اس مجاہد جلیل کو عالم آخرت کی سربلندی سے سرفراز فرمائے، اور شہداء و صدیقین کا رفیق بنائے۔

افسوس ہے کہ گذشتہ مہینہ اردو زبان کے مشہور محسن اور نامور مصنف رام بابو سکسینہ بھی ہم سے جدا ہو گئے، ابھی گذشتہ ہی مہینہ ۹ر دسمبر کو ان سے ہندوستانی اکیڈمی کے جلسہ میں ملاقات ہوئی تھی، کیا معلوم تھا کہ یہ آخری ملاقات ہے، ان کو اردو زبان کی خدمت سے عشق تھا، اور اس کو انھوں نے زندگی کا مشغلہ بنا لیا تھا، اردو زبان و ادب کی تاریخ پر بڑی قابل قدر کتابیں لکھیں، ان میں تاریخ ادب اردو بہت مشہور اور اس موضوع پر پہلی جامع و محققانہ کتاب ہے، اب اردو کے مختلف پہلوؤں پر بہت سی کتابیں لکھی جا چکی ہیں، مگر اس کتاب کی اولیت اپنی جگہ پر قائم ہے، اردو کے یورپین شعراء کا ایک ضخیم اور محققانہ تذکرہ بھی عرصہ ہوا لکھا تھا، ابھی تھوڑے ہی دن ہوئے قدیم شعراء کا ایک مرقع اور میر کی مثنویاں بخط میر شائع کی تھیں، ان کے علاوہ ان کی اور تصانیف بھی ہیں، جو ابھی شائع نہیں ہو سکی ہیں، اردو کی ایسی خدمت کی مثالیں اس دور میں کم ملیں گی، ابھی ہندوستانی اکیڈمی کے جلسہ میں جہاں پورا ماحول اردو کا مخالف تھا، اس کی صریح حمایت میں تنہا ان ہی کی آواز بلند ہوئی تھی، ہندوستان کی موجودہ فضا کو دیکھتے ہوئے ہندوؤں میں آیندہ اردو کے ایسے شیدائی پیدا ہونے کی امید کم ہے،

یادگار زمانہ ہیں یہ لوگ سن رکھو تم فسانہ تھے یہ لوگ

آندھرا پردیش کے وزیر اعلیٰ نے حال میں اپنی تقریر میں اعلان کیا ہے کہ اردو بھی آندھرا کی ایک زبان رہے گی، اور جو اردو بولنے والے تلگو نہیں جانتے، ان کو ملازمتوں کے ملنے میں کوئی دشواری نہ ہوگی، یہ منصفانہ اعلان ان تمام صوبوں کے لیے قابل تقلید نمونہ ہے جہاں اردو بھی بولی جاتی ہے، آندھرا میں تو یہ روشنی مگر چراغ تلے اب تک اندھیرا بلکہ اندھیر ہے، یعنی اس صوبہ میں جو اردو کا اصل مرکز ہے حکومت کے رویہ میں کوئی فرق نہیں آیا، کاش اس کے وزیر اعلیٰ کو بھی یہ توفیق ہوتی، اب تو چشم بددور وہ مشاعروں میں غزلیں بھی پڑھنے لگے ہیں، مگر جہاں اردو کے سرکاری حقوق کا سوال آیا کانوں پر ہاتھ دھرتے ہیں، بلکہ اب تو حکومت اتر پردیش کے نیم سرکاری اداروں سے بھی اردو کو ختم کرنا چاہتی ہے، چنانچہ ہندوستانی اکیڈمی الہ آباد کے دستور میں ایسی تبدیلی کرانا چاہتی ہے جس سے اکیڈمی خالص ہندی اکیڈمی ہو جائے گی، اور ہندی کی ذیلی شاخوں اودھی اور بھوجپوری وغیرہ اتر پردیش کی معمولی بولیوں کے ساتھ محض کہنے کے لیے اردو کا بھی نشان رہ جائے گا، چنانچہ اس پر غور کرنے کے لیے گذشتہ مہینہ اکیڈمی کی کونسل کا جلسہ ہوا تھا، اردو کے حامی اس کو بھی غنیمت سمجھکر ضمناً ہی سہی اردو کے نام کی تصریح کرانا چاہتے تھے، مگر ممبروں کی اکثریت حکومت کی تجویز کی موید تھی، اس لیے

یہ بھی نہ ہوسکا اور اردو کے ممبروں کو چار و ناچار اکثریت کا فیصلہ ماننا پڑا،

اس مرتبہ اکیڈمی کے جلسہ میں ادبی نشست بھی ہوئی تھی جس میں اردو اور ہندی کے مقالے پڑھے گئے تھے، ہندی کے مقالوں کی زبان اتنی مشکل تھی کہ اس کا سمجھنا دشوار تھا یہی حال تقریروں کا بھی تھا، البتہ ڈاکٹر تارا چند کا مقالہ قابل فہم اور اپنے سنجیدہ اور متوازن خیالات اور علمی و لسانی حیثیت سے بھی نہایت قابل قدر تھا، اکبر الہ آبادی پر مولانا عبدالماجد صاحب دریابادی کا مقالہ "ذکر اس پری وش کا اور پھر بیان اپنا" کا مصداق تھا، اس مرتبہ مدتوں کے بعد ادبی نشست ہوئی، امید ہے کہ آئندہ بھی یہ مفید سلسلہ قائم رہے گا،

اردو کے مسئلہ سے فرار اور اس کی اہمیت گھٹانے کے لیے اب یہ طریقہ اختیار کیا گیا کہ اردو کوئی مستقل زبان ہی نہیں ہے، بلکہ وہ ہندی ہی کا ایک اسلوب اور اتر پردیش کی دوسری معمولی بولیوں کی طرح ہندی کی ایک ذیلی شاخ ہے، حالانکہ اردو کی قانونی حیثیت یہ ہے کہ ہندوستان کے دستور میں اس کو ہندی سے الگ ایک مستقل زبان مانا گیا ہے، اور حقیقت کے اعتبار سے اردو نہ صرف ایک مستقل زبان ہے بلکہ ان بے شمار ذرائع کے باوجود جو ہندی کی ترقی بلکہ ایک مصنوعی زبان کو گڑھنے میں صرف کیے جارہے ہیں، آج بھی اردو ہر حیثیت سے ہندی سے زیادہ ترقی یافتہ ہے اور ابھی اس نومولود ہندی کو اردو کے درجہ تک پہنچنے میں عرصہ لگے گا، اردو کی ادبی دلکشی پر آج بھی ہندی کے خوش مذاق ادیب ریجھے ہوئے ہیں اور جو ادیب واقعی ہندی کی ترقی چاہتے ہیں وہ اردو کے حسن و لطافت اور اس کی شائستگی اور نفاست کو ہندی میں جذب کرنے کی کوشش کر رہے ہیں،

لیکن اگر بالفرض یہ دعویٰ مان بھی لیا جائے کہ اردو کوئی مستقل زبان نہیں بلکہ ہندی ہی کی ایک معمولی شاخ اور اس کا ایک اسلوب ہے تو پھر اردو ادب و ثقافت کے آثار ہندی کی تصانیف خصوصاً اس کی نصابی کتابوں میں کیوں نظر نہیں آتے اور ہندی کے اسلوب ہی کی حیثیت سے سہی حکومت کے کسی شعبہ میں اس کو کیوں جگہ نہیں دی جاتی، درحقیقت یہ دعویٰ ایسا مضحکہ انگیز ہے کہ خود دعویٰ کرنے والوں کو بھی اس پر ہنسی آجاتی ہوگی،

مقالات

ساتویں صدی کے رجال السند والہند

از مولانا قاضی اطہر مبارکپوری

خلافت راشدہ کے ابتدائی دور میں بلکہ بعض روایات کی بنا پر عہد رسالت ہی میں اسلام ہندوستان کے ساحلی حدود میں پہنچ گیا، اور عرب و ہند کے مابین قدیم تجارتی تعلقات کے ساتھ ساتھ نئے دینی، علمی اور ثقافتی تعلقات بھی پیدا ہونے لگے، اور عرب فاتحوں اور ہندوستان کے لوگوں میں باہمی تعارف سے گہری دلچسپی ہونے لگی، چنانچہ ہمارے علم میں سب سے پہلے عہد رسالت ہی میں ہندوستان کے جزیرہ سرندیپ سے دو آدمیوں پر مشتمل ایک وفد مدینہ منورہ روانہ ہوا تاکہ وہ اسلام کے بارے میں صحیح معلومات حاصل کرے، اور سرندیپ کے لوگوں کو اس دین کے بارے میں صحیح معلومات بہم پہنچائے، مگر یہ وفد مدینہ اس وقت پہنچا جب کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا وصال ہو چکا تھا، بلکہ حضرت ابوبکر صدیقؓ کا دور بھی ختم ہو چکا تھا اور حضرت عمرؓ کی خلافت کا زمانہ تھا، اس وفد نے چند دنوں وہاں رہ کر اسلام اور مسلمانوں کا بغور مطالعہ کیا، واپسی میں اس وفد کا رئیس تو راستہ ہی میں مر گیا، مگر اس کے ملازم نے سرندیپ پہنچکر تمام چشم دید واقعات بیان کیے،

اس کے کچھ دنوں بعد حضرت عثمانؓ کی خلافت میں مسلمانوں کی طرف سے والیِ عراق عبد اللہ ابن عامر بن کریز کے زیر اہتمام حضرت حکیم بن جبلہ عبدیؓ ہندوستانی حدود میں یہاں کے حالات معلوم

کرنے کے لیے آئے، اور واپسی پر اپنی مختصر سی رپورٹ پیش کی،

اس طرح جانبین میں تعارف و تعلق کی صورتیں پیدا ہوتی رہیں، اور اسلامی فتوحات کی برکت سے سیاسی، دینی، علمی اور ثقافتی تعلقات بڑھتے گئے،

ساتویں صدی تک ہندوستان پر مستقل تصنیفات

دوسری صدی گذرتے گذرتے سندھ کا پورا علاقہ عالم اسلام کا ایک جزو بن گیا اور مسلمان مصنفوں نے اپنی تصنیفات میں ہندوستان کے اس خطہ کو مستقل مقام دیا، اور دوسرے اسلامی ممالک کی طرح یہاں کے واقعات و حالات اور رجال کو مدون کرنا شروع کیا،

(۱) چنانچہ قدماء میں علی مدینی متوفی ۲۲۵ھ نے ہماری تحقیق میں سب سے پہلے ہندوستان پر دو مستقل کتابیں لکھیں، یہ زبردست مورخ اور ماہر انساب تھے، ابن ندیم نے تقریباً پانچ صفحات میں الگ الگ عنوان کے ماتحت ان کی تصنیفات کی فہرست دی ہے، علی مدینی کے بارے میں علمائے تاریخ کا یہ فیصلہ ہے،

"ان المدینی تاجر خراسان والھند وفارس یزید علی غیرہ"

فتوحات پر انھوں نے جو کتابیں لکھی ہیں، ان میں دو کتابوں کے نام یہ ہیں (۱) کتاب ثغر الھند، (۲) کتاب عمال الھند، یہ دونوں کتابیں غالباً دوسری صدی کے خاتمہ پر لکھی گئیں، اور مسلمانوں کے بے شمار علمی خزانوں کی طرح یہ بھی دنیا سے ناپید ہو گئیں،

(۲) اس کے بعد تیسری صدی میں ہندوستان پر کسی مستقل عربی تصنیف کا پتہ نہیں چلتا، البتہ علامہ بلاذری متوفی ۲۷۹ھ نے ۲۵۵ھ میں فتوح البلدان جیسی اہم کتاب لکھی، اس میں "فتوح السند" کا مستقل عنوان قائم کرکے تیسری صدی کے وسط تک کے حالات تفصیل سے درج کیے۔ اس باب کو ہم ہندوستان کی مستقل اسلامی تاریخ قرار دیتے ہیں، جو فتوح البلدان کے ساتھ

ہمارے پاس آج بھی موجود ہے،

(۳) بزرگ بن شہریار ہرمزی ناخدا جو چوتھی صدی میں سیراف، ہندوستان اور چین کے درمیان بحری سفر کیا کرتا تھا، اور جہازرانی میں بڑا ماہر تھا، اس نے "عجائب الہند" کے نام سے ایک بڑی قیمتی کتاب لکھی جس میں ہندوستان کے بارے میں دینی، تجارتی، سیاسی، اقتصادی اور ثقافتی قیمتی معلومات درج ہیں، یہ کتاب بھی موجود ہے اور چھپ گئی ہے،

(۴) علامہ چلپی نے کشف الظنون میں محمد بن یوسف ہروی کی "تاریخ الہند" کی نشاندہی کی ہے، غالباً یہ بھی چوتھی صدی کی تصنیف رہی ہو، مگر آج اس کا کہیں وجود نہیں ہے،

(۵) الور (سندھ) کے قاضی و خطیب اسمٰعیل بن علی ثقفی سندھی (موجود [illegible]) کے آباء و اجداد میں سے کسی عالم نے "تاریخ السند وغزوات المسلمین علیہا وفتوحاتہم" کے نام سے ایک کتاب عربی زبان میں لکھی تھی، غالباً کشف الظنون میں "تاریخ السند" سے مراد یہی کتاب ہے، جو غالباً پانچویں صدی میں لکھی گئی ہوگی، مگر اب اس کا کوئی نام و نشان نہیں ملتا،

(۶) پانچویں صدی کے شروع میں ہندوستان پر ایک مفید کتاب علامہ بیرونی (متوفی ۴۴۳ھ) نے "کتاب الہند" کے نام سے لکھی، جس میں زیادہ تر یہاں کے قدیم علوم و فنون اور مذاہب وغیرہ کا بیان ہے، یہ کتاب ہمارے ہاتھوں میں موجود ہے،

(۷) علی بن حامد بن ابوبکر کوفی اوشی سندھی نے ۶۱۳ھ میں الور کے قاضی و خطیب اسمٰعیل بن علی ثقفی کے جد اعلیٰ کی تاریخ السند (عربی) کے اجزاء حاصل کرکے ان کا فارسی میں ترجمہ کیا، اور مزید اضافہ کے ساتھ فارسی زبان میں "تاریخ سند" مرتب کی، مگر اس کتاب کا بھی کہیں پتہ نہیں چلتا،

یہ سرسری جائزہ ان کتابوں کے سلسلے میں ہے، جو ساتویں صدی تک خاص طور سے ہندوستان

کے موضوع پر لکھی گئیں، اور کسی نہ کسی پہلو سے ان کا تعلق صرف ہندوستان سے تھا، اور وہ بالکلیہ ہندوستان کے بارے میں تھیں،

اس دور کی عام کتابیں جن میں ہندستان کا ذکر موجود ہے

ان کتابوں کے علاوہ اس زمانہ میں تاریخ، جغرافیہ، سفرنامہ اور رجال عام پر بہت سی کتابیں لکھی گئیں، جن میں جزوی طور سے ہندوستان اور اس کے مقامات و رجال کا تذکرہ ہے، مثلاً

(۱) رحلۃ سلیمان التاجر (موجود ۲۳۷ھ)

(۲) رحلۃ ابوزید سیرافی (موجود ۲۶۴ھ)

یہ دونوں کتابیں اگرچہ مختصر ہیں، مگر ان میں ہندوستان کے سیاسی، جغرافیائی اور تمدنی و دینی حالات سے متعلق بیش قیمت معلومات ہیں، اور یہ دونوں کتابیں اس سلسلہ کی پہلی کڑی ہیں۔

(۳) کتاب البلدان، لابن الفقیہ ہمدانی، متوفی حدود ۲۹۰ھ

(۴) المسالک والممالک، لابن خرداذبہ متوفی حدود ۳۰۰ھ

(۵) مسالک الممالک، اصطخری،

(۶) الاعلاق النفیسہ، لابن رستہ،

(۷) مروج الذہب میں علامہ مسعودی نے ۳۰۳ھ تک سندھ، گجرات اور جیمور (بمبئی) کی سیر و سیاحت کر کے بہت سے مفید حالات قلمبند کیے،

(۸) اخبار الزمان، یہ بھی علامہ مسعودی کی ایک ضخیم کتاب ہے، اس کا ایک حصہ مصر میں حال میں چھپا ہے، میرے پاس یہ نسخہ موجود ہے، اس میں اور رحلۃ ابی زید سیرافی میں بہت سی باتیں مشترک ہیں، بلکہ عبارتیں تک ایک ہی قسم کی ہیں، اس میں بحر ہند کے جزائر کے بارے میں خاص طور

سے نہایت مفید معلومات درج ہیں،

(۹) کتاب صور الارض ابن حوقل

(۱۰) احسن التقاسیم فی معرفۃ الاقالیم میں علامہ مقدسی بشاری نے "اقلیم السند" کے تحت بڑے نادر واقعات اور ضروری باتیں درج کی ہیں (سنہ تالیف ۳۷۷ھ)

(۱۱) رحلۃ ابی دلف مسعر بن مہلہل ینبوعی، موجود ۳۳۱ھ، یہ بہت بڑا سیاح اور شاعر تھا، اس نے بغداد سے چین کا سفر کیا، اور واپسی پر ہندوستان کے ساحلی مقامات کی سیر کی اور یہاں کے حالات تفصیل سے اپنے سفرنامہ میں درج کیے، اس سفرنامہ کا بڑا حصہ علامہ یاقوت حموی نے معجم البلدان میں چین کے ذکر میں نقل کیا ہے، اس میں تقریباً ہندوستان کا پورا حصہ آگیا ہے، علامہ ابن ندیم نے الفہرست میں جگہ جگہ ابودلف کے حوالے دیے ہیں، یہ مقدسی بشاری کا ہمعصر تھا،

(۱۲) قانون مسعودی، البیرونی متوفی ۴۳۱ھ نے اپنی بیش قیمت کتاب قانون مسعودی میں ہندوستان کے مقامات کا تذکرہ کیا ہے، یہ کتاب حیدرآباد میں چھپ کر قدر دانوں کے ہاتھ میں پہنچ چکی ہے،

(۱۳) تحفۃ الالباب میں ابوحامد اندلسی غرناطی موجود ۵۵۷ھ نے مختصر طور پر ہندوستان کا تذکرہ کیا ہے،

(۱۴) کتاب الانساب میں علامہ سمعانی متوفی ۵۶۲ھ نے ہندوستان کے مقامات کی نسبت سے یہاں کے بہت سے رجال کا مختصر تذکرہ کیا ہے،

(۱۵) معجم البلدان میں علامہ یاقوت حموی رومی بغدادی متوفی ۶۲۶ھ نے ہندوستان کے مقامات (جو عام طور سے ساحلی ہیں) کا ذکر کرتے ہوئے ان کے مشاہیر کا تذکرہ بھی کیا ہے، اس اعتبار سے یہ دونوں کتابیں ہمارے لیے نہایت ہی اہم ہیں کہ ان میں ہندوستان کے

بہت سے رجال کے تذکرے پائے جاتے ہیں اور یہ دونوں کتابیں چھپ کر شائع ہو گئی ہیں، ان کے علاوہ مذکورۂ بالا کتابیں جغرافی معلومات پر بھی مشتمل ہیں، اور ان میں کہیں کہیں بعض ہندوستانیوں کا حال بھی ضمنی طور سے مل جاتا ہے، اور یہ بھی بسا غنیمت ہے کہ ان ہی بکھرے موتیوں سے ہندوستان کے رجال کی لڑی پروئی جاسکتی ہے،

اس دور کی ایک تلخ حقیقت ان تمام باتوں کے باوجود یہ ایک تلخ حقیقت ہے کہ ساتویں صدی تک جو اسلامی تاریخ کا عہد زریں ہے، ایک کتاب بھی ہندوستان کے رجال پر نہیں لکھی گئی، جبکہ اسی دور میں عالم اسلام کے ایک ایک شہر کی مسلمانوں نے تاریخ کئی کئی جلدوں میں مرتب کی اور وہاں کے رجال کے تذکرے لکھے، اسی دور میں تاریخ بغداد، تاریخ دمشق، شام، جرجان، تاریخ موصل اور اسی طرح کی سیکڑوں تاریخیں لکھی گئیں، اور ہر جگہ کے علماء، محدثین، فقہاء، اور ارباب علم و فن کے حالات قلم بند کیے گئے، اگر محروم القسمت ہندوستان اپنی اسلامی تاریخ اور رجال کے بارے میں ایسا کوئی سرمایہ جمع نہ کر سکا جس سے معلوم ہو کہ اس وسیع و عریض ملک میں اسلام اور مسلمانوں کی چلتی پھرتی برکتیں کس تعداد میں تھیں، ممکن ہے اسمٰعیل بن علی قاضی الور کے جد اعلیٰ کی تاریخ السند اور علامہ محمد بن یوسف ہروی کی تاریخ الہند اس کمی کو پورا کرتی رہی ہوں، مگر ہمارے پاس ان کے نام کے سوا کچھ نہیں رہ گیا ہے،

البتہ اس سلسلہ میں ہمیں غیر ہندی مورخوں اور مصنفوں کا شکر گزار ہونا چاہیے کہ انھوں نے اپنی تصنیفات میں جہاں تک ہندوستانی رجال اور ان کے جس قدر حالات مل سکے ان کو تاریخ اسلام کے صفحات میں جگہ دی، اگر ان کا یہ کرم نہ ہوتا تو ہندوستان کے دینی اور علمی رجال کا بڑا سرمایہ مسلمان قوم سے چھن گیا ہوتا، چنانچہ تاریخ و رجال کی عام اسلامی کتابوں میں ہندوستان کے بہت سے رجال کے تذکرے آج بھی موجود ہیں، جن کو ہم جمع کر کے تلافیِ مافات کر سکتے ہیں، آیندہ جو فہرست

پیش کی جارہی ہے، وہ اسی کاوش کا ایک نمونہ ہے،

متاخرین علمائے ہند کا ذوق تذکرہ نویسی ساتویں صدی تک ہندوستانی مصنفین میں اگر کسی نے اپنے ملک کی تاریخ پر کچھ کام کیا ہے تو الور کے قاضی کے جد اعلیٰ اور علی بن حامد کوفی اوشی نے، مگر ان دونوں کی کتابوں کے بھی صرف نام باقی ہیں، اس کا مطلب یہ ہے کہ ساتویں صدی تک ہندوستان کے رجال پر کوئی کام نہیں ہوا، یا اگر کچھ ہوا تو ہم اس سے محروم ہیں، پھر غفلت کا یہ سلسلہ ساتویں صدی پر ختم نہیں ہو جاتا، بلکہ آٹھویں اور نویں صدی بھی اس کام سے خالی ہی نظر آتی ہے، البتہ دسویں صدی میں اکبری دور میں میر معصوم بھکری سندھی نے فارسی زبان میں تاریخ سندھ لکھی، جس کے قلمی نسخے بعض بعض کتب خانوں میں پائے جاتے ہیں، میں نے اس کا ایک قلمی نسخہ دیکھا ہے، اور اس سے استفادہ کیا ہے،

اسکے بعد گیارہویں صدی میں جہانگیری دور میں محمد طاہر نسیانی (ٹھٹھوی) نے فارسی زبان میں تاریخ سندھ لکھی، اس کتاب کے بارے میں ہمیں کچھ معلومات نہیں ہیں، ان سب کے آخر میں تحفۃ الکرام کے نام سے سندھ کی ایک اور تاریخ فارسی میں لکھی گئی، جس میں ۱۱۸۰ھ تک کے حالات درج ہیں، اس کی تیسری جلد کا قلمی نسخہ میرے پاس ہے، جس میں سندھ کے بہت سے ارباب علم و فضل اور امراء کا حال ہے، اسی زمانہ کے لگ بھگ ارغوان نامہ اور ترخان نامہ کتابیں لکھی گئیں، جن میں یہاں کے کچھ حالات ہیں، جیسا کہ تحفۃ الکرام کے مقدمہ میں درج ہے،

اس دور کی کتابوں میں شاہ عبد الحق صاحب محدث دہلوی کی کتاب اخبار الاخیار، شیخ عبد القادر عیدروس بھروچی کی النور السافر، علامہ زین الدین معبری ملیباری کی تحفۃ المجاہدین اور تاریخ فرشتہ نہایت مفید اور کار آمد کتابیں ہیں جو ملتی بھی ہیں،

ان کتابوں کے علاوہ اس دور میں سوانح و تذکرہ پر بہت زیادہ لکھا گیا، مگر اس دور کی خصوصیت یہ تھی کہ تاریخ و تذکرہ نویسی کے بجائے منقبت نویسی اور قصیدہ خوانی کا رنگ

اس قدر غالب ہوگیا کہ رجال وتذکرہ کی کتابیں افسانوی رنگ میں ڈوب گئیں، اور جب ہندوستان کی
کے قدیم رجال سے ہٹ کر بعد کے رجال پر لکھنے کی باری آئی تو ان کو عام طور سے مافوق الفطرت
رنگ میں پیش کرنے کا ذوق عام ہوگیا، اس صورتِ حال کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہندوستان کے ائمۂ دین
اور ماہرین علم وفن کا نام ونشان مٹ گیا، اور حضرات مشائخ رحمہم اللہ کے تذکروں سے کتابیں
بھر گئیں، علامہ آزاد بلگرامی متوفی ۱۲۰۰ھ نے مآثر الکرام میں حضرت ملا نظام الدینؒ کے ذکر میں
اس المناک حقیقت کا ماتم ان الفاظ میں کیا ہے،

"اصل این است کہ مردم ہند در حفظ احوال مشائخ طریقت قدس اللہ اسرارہم
اہتمامی داشتہ اند، و بہ ضبط احوال دانشمندان کم پرداختہ، وکتابے مستقل دریں باب از سلف
و خلف استماع نیفتاد، وکتاب عین العلم ناطق است کہ مصنف او از اجلۂ علماء واتقیاے
روزگار بود، بقول اصح ہندی الاصل است، ملا قاری در شرح عین العلم گوید "ہو من فضلاء
الہند وصلحائہم علی ما صرح بہ الشیخ ابن حجر العسقلانی فی شرح مقدمۃ" کہ از مورخان ہند
احوال او را ضبط نکرد، باوجود ایں چنیں تصنیف عالی گویا نامش از صفحۂ روزگار محو گردیدہ"

(مآثر الکرام ج ۱ ص ۲۳۳)

علامہ آزاد بلگرامی عین العلم کے مصنف کو رو رہے ہیں اور یہاں حال یہ ہے کہ پورے
عالم اسلام کی ہندوستانی مسلّمہ شخصیتوں کو ہندوستان کے ارباب قلم بھلائے بیٹھے ہیں، اسی
اندوہناک صورتِ حال کے باعث امام علی متقی جونپوری برہانپوری مکیؒ صاحب کنز العمال،
امام قطب الدین نہری مکی مفتی مکہ کے امام، محمد طاہر پٹنی گجراتیؒ صاحب مجمع البحار، امام مرتضیٰ
بلگرامی زبیدی مصری صاحب تاج العروس، امام شاہ ولی اللہ محدث دہلوی صاحب حجۃ اللہ البالغہ
اور ان کی جیسی صدہا علمی اور دینی ہستیوں کے تذکرے اگر ہندوستان میں ملتے بھی ہیں تو چند سطروں

یا چند اوراق وصفحات سے زیادہ نہیں، جب کہ ان کے مقابلہ میں ہر اعتبار سے کم مرتبہ کے حضرات کے
تذکروں سے موٹی موٹی کتابیں بھری پڑی ہیں،

ہندوستان کی اسلامی تاریخ ورجال کے بارے میں اس المناک حقیقت کے پیش نظر مورخ ہند
علامہ غلام علی آزاد متوفی ۱۲۰۰ھ نے متاخرین کے ذوق سوانح نگاری سے ہٹ کر قدیم مسلم تذکرہ نویسوں
کا طریقہ اختیار کیا، اور فارسی میں "مآثر الکرام" اور عربی میں "سبحۃ المرجان فی آثار ہندوستان" جیسی
قابل قدر کتابیں لکھیں، اور جہاں تک ان سے ہوسکا ارباب علم وفضل اور اصحاب کمال کے تذکرے لکھے،

علامہ آزاد بلگرامی نے ہندوستان کے رجال کے لیے تاریخ نویسی کی جو بنیاد ڈالی تھی، اس
پر ایک صدی گذرتے گذرتے ایک نہایت ہی شاندار اور پائدار محل تیار ہوگیا، یعنی فاضل اجل
علامہ سید عبدالحیؒ ناظم ندوۃ العلماء، متوفی ۱۳۴۱ھ نے پہلی صدی ہجری سے لیکر اپنے دور تک
کے ہندوستانی علماء کے حالات میں ایک ضخیم کتاب "نزہۃ الخواطر وبہجۃ المسامع والنواظر" کے
نام سے لکھی، جو آج ہمارے اسلامی مفاخر میں سے ایک اہم چیز ہے، اور اس موضوع پر آج تک
جو کچھ لکھا گیا ہے اس میں سب سے زیادہ جامع اور مکمل تصنیف ہے،

لیکن بحث وتحقیق کا دروازہ نہ اب بند ہے اور نہ آئندہ ہی بند ہوگا، چنانچہ اب سے
آٹھ سال پہلے راقم الحروف نے بھی اس کی طرف توجہ کی، اور اس اثنا میں اسلامی تاریخ ورجال
کے جس قدر اسفار مل سکے ان کو کھنگالا، تو محنت کے اعتبار سے بہت کم مگر الحمد للہ امید سے بہت
زیادہ کامیابی ہوئی، اور "رجال السند والہند" کے نام سے عربی میں ایک ضخیم کتاب تیار ہوگئی،
جس میں زیادہ زور ساتویں صدی کے پہلے کے ہندوستانی رجال پر دیا گیا ہے، کیونکہ اس دور تک
کے حالات ملتے ہی نہیں اور اس کے بعد کے لوگوں کے حالات کسی نہ کسی رنگ میں تھوڑے بہت ملتے ہیں،
آئندہ صفحات میں اس آٹھ سالہ مطالعہ کا نچوڑ پیش کیا جارہا ہے، او واضح رہے کہ ہم نے صرف

ان رجال کو لیا ہے جو (۱) ہندوستان میں پیدا ہوئے اور یہیں کے ہو رہے، خواہ وہ نسلاً ہندی ہوں یا کسی اور ملک سے تعلق رکھتے ہوں (۲) جو ہندی الاصل تھے، مگر دوسرے ممالک اسلامیہ میں جا کر رہ گئے، (۳) جو دوسرے ممالک میں پیدا ہوئے اور وہیں رہے، مگر ان کے آبا و اجداد ہندی الاصل تھے، باہر سے ہندوستان میں آنے والے رجال کا ذکر اس میں نہیں کیا ہے، کیونکہ اکثر ایسے حضرات کے تذکرے کسی نہ کسی نوعیت سے موجود ہیں، اگر اللہ تعالیٰ نے توفیق دی تو اس پر مستقل کام کرکے "ہندی رجال" کا پورا حق ادا کیا جائے گا،

"رجال الہند والسند" کی جو فہرست پیش کی جا رہی ہے، اس میں حسب ذیل امور خاص طور سے قابل لحاظ ہیں،

(۱) پہلے ہندوستان یا سندھ کے اصل وطن کی صفت بیان کی گئی ہے، پھر جس ملک یا شہر میں قیام رہا، اس کی نسبت درج ہے، تاکہ دونوں وطنوں کی وطنیت کی تعیین ہو سکے (۲) بعض اشخاص کو متعدد عنوانات کے ماتحت لکھا گیا ہے، کیونکہ ان کی جامعیت اس کی متقاضی تھی، (۳) حتی الامکان زمانہ کے تعیین کی کوشش کی گئی ہے (۴) قدما کی تقسیم کے مطابق سندھ اور ہند کو الگ الگ ملک مان کر ہند میں اس کے قدیم ملحقہ جزائر کو بھی لے لیا گیا ہے، اور سندھ میں اسکے قدیم اطراف و جوانب کو داخل کیا گیا ہے، (۵) فہرست میں مآخذ و مصادر کو نہیں لیا گیا ہے، کیونکہ اصل کتاب میں ایک ایک لفظ کا حوالہ ہے،

اگر اللہ تعالیٰ نے چاہا تو بمبئی کی ایک مخیر اور متدین فرم محمد احمد برادرس کے زیر اہتمام یہ کتاب بہت جلد مصر میں یا مصری ٹائپ میں چھپ جائے گی، جو اس اجمالی فہرست کی تفصیل ہوگی، واللہ الموفق والمعین،

محدثین و حفاظ

(۱) احمد بن سندی بغدادی، ابو بکر حداد، آپ اپنے وقت کے ابدال بھی مانے جاتے تھے،

مستجاب الدعوت تھے، ابو نعیم اصبہانی نے حلیۃ الاولیاء میں آپ سے جگہ جگہ روایت کی ہے، وفات ۳۵۹ھ،

(۲) احمد بن سندی بن فروخ بغدادی مطرز، موجود ۳۰۰ھ

(۳) احمد بن سندی رازی، باغی، موجود ۳۰۰ھ

(۴) احمد بن عبد اللہ بن سعید، ابو العباس دیبلی نیشاپوری، وفات رجب ۳۴۳ھ،

(۵) احمد بن قاسم بن سیما ابن السندی، ابو بکر بغدادی معدل موجود ۳۰۰ھ

(۶) احمد بن محمد، ابو بکر منصوری بکرآبادی، وفات جمادی الاولیٰ ۴۲۲ھ

(۷) احمد بن محمد، ابو العباس دیبلی مصری، حافظ حدیث و زاہد، وفات ۳۷۳ھ

(۸) احمد بن محمد بن حسین بن سندی مصری، ابو الفوارس صابونی، مسند مصر، وفات شوال ۳۴۵ھ امام شافعی کے مشہور تلمیذ ربیع بن سلیمان کے شاگرد ہیں،

(۹) احمد بن محمد بن صالح، ابو العباس قاضی منصوری داؤدی، مقدسی نے آپ سے چوتھی صدی کے وسط میں منصورہ میں ملاقات کی ہے، آپ کا حلقۂ درس قائم تھا،

(۱۰) احمد بن محمد بن ہارون بن سلیمان بن علی، ابو بکر دیبلی، رازی، بغدادی، آپ محدث اور مقری تھے، وفات رجب ۳۷۰ھ

(۱۱) ابراہیم بن علی سندی، موجود ۴۰۰ھ،

(۱۲) ابراہیم بن سندی بن شاہک بغدادی، دولت عباسیہ کے مشہور رجال میں سے ہیں، علم حدیث کے ساتھ ساتھ فصاحت و بلاغت اور خطابت میں بھی بے نظیر تھے،

(۱۳) ابراہیم بن محمد بن ابراہیم بن عبد اللہ، دیبلی بغدادی، موجود ۴۰۰ھ

(۱۴) احید بن حسین بن علی، ابو محمد بامیانی سندی،

(۱۵) اسلم بن سندی، آپ سے ابو الحسن بن علی بن حسن ستاری نے روایت کی ہے،

(۱۶) اسمٰعیل لاہوری، سب سے پہلے لاہور میں آپ ہی کے ذریعہ حدیث و تفسیر کا علم آیا، وفات سنہ ۴۴۸ھ

(۱۷) اسمٰعیل بن سندی، ابو ابراہیم بغدادی خلال، موجود سنہ ۴۰۰ھ

(۱۸) اسمٰعیل بن محمد بن رجا، سندی نیشاپوری،

(۱۹) ابو جعفر سندی، موجود سنہ ۳۰۰ھ

(۲۰) ابو العلاء ہندی بغدادی، غالباً موجود سنہ ۴۰۰ھ

(۲۱) ابو محمد ہندی بغدادی موجود سنہ ۴۰۰ھ

(۲۲) ابو الہندی بغدادی، موجود سنہ ۴۰۰ھ

(۲۳) ابو الہندی، آپ نے حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت کی ہے،

(۲۴) ابو الہندی، آپ نے طالوت سے اور آپ سے معتمد نے روایت کی ہے،

(۲۵) بختیار بن عبد اللہ، ابو الحسن ہندی بوشنجی زاہد، محدث، وفات سنہ ۵۴۳ھ

(۲۶) جعفر بن خطاب ابو محمد قصداری سندی بلخی، موجود قبل سنہ ۵۰۰ھ

(۲۷) جیش بن سندی بغدادی قطیعی، تلمیذ امام احمد بن حنبلؒ،

(۲۸) حسن بن حامد بن حسن بن حامد بن حسن بن حامد، ابو الحسن دیبلی بغدادی، آپ نے دمشق اور مصر میں احادیث کی روایت کی، بڑے متمول تھے، بغداد میں ان کی ایک مستقل سرائے "خان حامد دیبلی" کے نام سے تھی، مشہور شاعر متنبی سے یارانہ تھا، مصر میں شوال سنہ ۴۰۷ھ میں وفات پائی،

(۲۹) حسن بن محمد بن حسن بن حیدر بن علی بن اسمٰعیل، ابو الفضائل رضی الدین لاہوری صغانی بغدادی، صاحب مشارق الانوار وغیرہ، وفات سنہ ۶۵۰ھ

(۳۰) حسین بن محمد بن ابو معشر نجیح، ابو بکر سندی بغدادی، وفات رجب سنہ ۳۴۰ھ

(۳۱) حسین بن محمد بن اسد، ابو القاسم دیبلی دمشقی، موجود سنہ ۳۴۰ھ

(۳۲) خلف بن سالم، ابو محمد مخرمی سندی بغدادی، مشہور حافظ حدیث تھے، وفات رمضان سنہ ۲۳۱ھ،

(۳۳) خلف بن محمد دیبلی بغدادی، موازینی، آپ نے دیبل میں اپنے معاصر امام علی بن موسیٰ دیبلی سے روایت کی، نیز بغداد میں ان سے روایت کی، موجود سنہ ۴۰۰ھ

(۳۴) داؤد بن محمد بن ابو معشر نجیح بن عبد الرحمٰن، ابو سلیمان سندی بغدادی، آپ نے اپنے دادا کی تصنیف کتاب المغازی کی روایت کی ہے،

(۳۵) رجاء بن سندی ابو محمد نیشاپوری، موجود غالباً سنہ ۲۲۱ھ

(۳۶) سعد بن عبد اللہ ابو الخیر سرندیبی اصبہانی، موجود سنہ ۴۰۰ھ،

(۳۷) سندی، ابو بکر خواتیمی بغدادی، تلمیذ امام احمد بن حنبل،

(۳۸) سندی بن ہارون، موجود سنہ ۳۰۰ھ

(۳۹) سندی بن ابان، ابو نصر بغدادی، وفات ذی الحجہ سنہ ۲۸۱ھ

(۴۰) سندی بن سماش بصری، موجود سنہ ۳۰۰ھ

(۴۱) سندی بن عبد ربہ کلبی رازی، قاضی ہمدان و قزوین، اپنے وقت میں رے کے سب سے بڑے محدث تھے، اصل نام سہل بن عبد الرحمٰن ہے، موجود سنہ ۳۰۰ھ

(۴۲) سہیل بن ذکوان، ابو السند واسطی مکی، موجود سنہ ۱۰۰ھ

(۴۳) سیبویہ بن اسمٰعیل، ابو داؤد احدی قزداری سندی مکی، وفات حدود سنہ ۴۶۰ھ

(۴۴) شعیب بن محمد بن احمد بن سعید بن بریغ بن سوار، ابو القاسم دیبلی مصری، موجود غالباً سنہ ۴۰۰ھ

(۴۵) عباس بن سندی، آپ کا ذکر میزان الاعتدال میں یحییٰ بن عباد مدنی کے ضمن میں ہے، نیز علامہ ابن عبد البر نے جامع بیان العلم میں آپ کے سلسلے سے روایت کی ہے،

(۴۶) عبد بن حمید بن نصر ابو محمد کشی سندی بغدادی، آپ مشہور حافظ حدیث اور مسند کشی کے

مصنف اور امام مسلم اور ترمذی وغیرہ کے استاذ ہیں، صاحب معجم البلدان نے آپ کو علاقہ "کچھ" کا
باشندہ بتایا ہے، جسے عربی میں "کس" کہتے ہیں، جرجان کے "کس" سے آپ کا تعلق نہیں ہے، وفات ۲۴۹ھ

(۴۷) عبداللہ بن جعفر بن مرۃ ابو محمد منصوری، محدث و مقری تھے، موجود غالباً ۳۰۰ھ

(۴۸) عبداللہ بن عبدالرحمٰن ملیباری، سندی، دمشقی، صیدا کے قریب مقام عذبون میں حدیث
کا درس دیتے تھے، موجود غالباً ۴۰۰ھ

(۴۹) عبداللہ بن محمد داوری، سندی،

(۵۰) عبدالرحمٰن بن سندی، موجود ۲۰۰ھ

(۵۱) عبدالرحمٰن بن عمرو سندی، بیروتی، حضرت امام اوزاعی نے آپ کے سندی الاصل
ہونے کے اقوال لکھے ہیں، مگر اس کے خلاف زیادہ اقوال ہیں،

(۵۲) عبدالرحیم بن حماد ثقفی سندی بصری، امام اعمش وغیرہ سے روایت کی ہے، موجود ۲۰۰ھ

(۵۳) عبدالصمد بن عبدالرحمٰن، ابوالفتح اشعثی لاہوری، وفات ۴۲۹ھ

(۵۴) علی بن بنان بن سندی، بغدادی، عاقولی، موجود غالباً ۳۰۰ھ

(۵۵) علی بن عبداللہ سندی، بغدادی، موجود ۲۴۶ھ

(۵۶) علی بن عمرو بن حکم، ابوالحسن لاہوری، موجود ۶۰۰ھ

(۵۷) علی بن موسیٰ دیبلی، بغدادی، آپ سے چوتھی صدی میں خلف بن محمد دیبلی نے دیبل اور بغداد
میں روایت کی ہے،

(۵۸) عمرو بن سعید لاہوری، حافظ ابوموسیٰ مدنی اصبہانی کے استاذ ہیں،

(۵۹) فضل اللہ بن محمد، ابوالمکارم بوقانی سندی، آپ امام بغوی سے ان کی کتاب مصابیح السنۃ
کے آخری راوی ہیں، موجود ۶۰۰ھ

(۶۰) فضل بن سکن بن سخیت، ابوالعباس سندی، بغدادی قطیعی،

(۶۱) مخلص بن عبداللہ، ابوالحسن مہذبی ہندی، بغدادی، موجود ۶۰۰ھ

(۶۲) محمد بن ابراہیم، ابوجعفر دیبلی مکی، محدث مکہ، وفات ۳۲۲ھ

(۶۳) محمد بن ابراہیم بیلمانی، بھیلمان گجرات اور کاٹھیاوار کے قریب مشہور قدیم مقام ہے
اور اُدھر کی کئی قوموں کا مرکز رہ چکا ہے،

(۶۴) محمد بن احمد بن محمد بن خلیل بن احمد بوقانی سندی، وفات محرم ۵۴۸ھ،

(۶۵) محمد بن احمد بن منصور بوقانی سندی، تلمیذ امام ابوحاتم محمد بن حیان بستی متوفی ۳۵۴ھ
آپ سے امام ابوعبداللہ حاکم وغیرہ نے روایت کی ہے،

(۶۶) محمد بن ایوب بن سلیمان بن یوسف بن اشرو سیندا و، ابوعبداللہ عودی کلبی بغدادی،
جنوبی ہند کی مشہور بندرگاہ کلکہ کے رہنے والے تھے، اور عود کے تاجر تھے، موجود ۳۰۰ھ

(۶۷) محمد بن حارث بیلمانی، کوفی،

(۶۸) محمد بن رجاء، ابوعبداللہ سندی، نیشاپوری،

(۶۹) محمد بن زیاد، ابوعبداللہ، ابن الاعرابی، سندی کوفی، مشہور امام لغت ہیں، اور حدیث
و فقہ میں قدیم علمائے اہل سنت کے مسلک پر تھے، وفات ۲۳۱ھ

(۷۰) محمد بن عبداللہ، ابومحسن سندی، بصری، موجود غالباً ۳۰۰ھ

(۷۱) محمد بن علی بن احمد، ابوبکر بامیانی مکی، محدث مکہ، وفات رجب ۳۹۰ھ

(۷۲) محمد بن عبدالرحمٰن بیلمانی کوفی، مولیٰ آل عمر، وفات مابین ۱۴۰ھ و ۱۵۰ھ

(۷۳) محمد بن مامون بن رشید بن ہبۃ اللہ، ابوعبداللہ لاہوری، خراسانی، مطوعی، بغداد
اور آذربائیجان وغیرہ میں حدیث کا درس دیا کرتے تھے، ۶۰۳ھ میں ملاحدہ کے ہاتھوں شہید ہوئے،

(۷۴) محمد بن عبداللہ، ابو العباس دیبلی بزاق، محدث وزاہد، وفات رمضان سنہ ۲۵۴ھ

(۷۵) محمد بن محمد بن خلف، ابو القاسم لاہوری، اسفرائینی، محدث وفقیہ اور مناظر تھے،

سمعانی نے محمود نام بتایا ہے، وفات حدود سنہ ۵۴۰ھ

(۷۶) محمد بن محمد بن رجا بن سندی، ابو بکر اسفرائینی، جرجانی، مصنف "الصحیح" مخرجہ علی

کتاب مسلم، تلمیذ امام احمد بن حنبل، وفات سنہ ۲۸۶ھ

(۷۷) محمد بن ابومعشر نجیح سندی، مدنی، بغدادی، وفات سنہ ۲۴۴ھ

(۷۸) فقی بن محمد بن عبداللہ، ابو المؤید باسندی، ہندی، بقول مقدسی باسند نام کا ایک مقام

ہندستان میں اور ایک اصفہان میں ہے، آپ کا ہندستانی ہونا بعض وجوہ سے راجح معلوم ہوتا ہے،

(۷۹) مکحول بن ابو سالم عبداللہ، ابو عبداللہ سندی، شامی مشہور امام وحافظ اور فقیہ حضرت مکحول شامی، وفات سنہ ۱۱۳ھ

(۸۰) منصور بن سندی اسکندرانی، ابو علی دباغ، وفات ربیع الاول سنہ ۶۴۶ھ

(۸۱) موسی سیلا نی (سیلونی) ابن معین نے آپ کی توثیق کی ہے،

(۸۲) موسیٰ بن سندی، ابو محمد جرجانی، بکرآبادی ؟ امام وکیع بن جراح کے ارشد

تلامذہ میں سے تھے، آپکے پاس امام وکیع کی کتابیں موجود تھیں، موجود سنہ ۳۰۰ھ

(۸۳) نجیح بن عبدالرحمٰن، ابو معشر سندی مدنی، مغازی کے سب سے بڑے امام تھے، آپ کی

تصنیف کتاب المغازی قدما میں بہت مشہور تھی، وفات سنہ ۱۷۰ھ

(۸۴) نصر اللہ بن احمد بن قاسم بن سیما، ابو محسن ابن السندی بغدادی، وفات ذوالقعدہ سنہ ۳۳۳ھ

(۸۵) نصر بن سندی بن شاہک بغدادی، موجود سنہ ۲۰۰ھ

(۸۶) ہبۃ اللہ بن سہل سندی، اصبہانی، موجود سنہ ۵۰۰ھ

(۸۷) یزید بن عبداللہ قرشی، ہبیری، ہندی، جمہور وغیرہ میں جو مسلمان عربی ہندی دونو ں

نسل سے تعلق رکھتے تھے، ان کو بیسر (جمع بیاسر) کہا جاتا تھا جیسا کہ مسعودی نے تصریح کی ہے،

(۸۸) یحیی، ابو معشر سندی، مولی ابن ہاشم، موجود غالباً سنہ ۲۰۰ھ

(۸۹) احمد بن محمد بن صالح منصوری، داؤدی کے ایک غلام آزاد کرنے کے بعد داؤدی نے

اپنے غلام سے احادیث کی روایت کی، اور انھوں نے ابوالحسن بن مفلس بغدادی المتوفی سنہ ۳۳۴ھ

سے روایت کی ہے، (باقی)

اسلام کا سیاسی نظام

اگرچہ اسلامی نظام حکومت کے مختلف پہلوؤں پر ادھر بہت سی کتابیں اور بکثرت مضامین لکھے گئے، لیکن جب یہ کتاب لکھی گئی تھی، اس وقت تک اس موضوع پر اردو میں کوئی کتاب موجود نہیں تھی لیکن بعض وجوہ سے اس کی اشاعت کی نوبت اب آئی ہے، کتاب موضوع کے اعتبار سے بہت جامع، مکمل اور سیر حاصل ہے، اس میں کتاب وسنت کی روشنی میں اسلام کے سیاسی نظام کا اساسی خاکہ پیش کیا گیا ہے، اور اس کے ایک ایک جز کی تفصیل کی گئی ہے، شروع میں مولانا عبدالماجد دریابادی کے قلم سے پیش لفظ بھی ہے،

(مؤلفہ مولانا محمد اسحٰق سندیلوی، استاذ دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنو) قیمت : صہ

تاریخ دعوت وعزیمت (حصہ دوم)

آٹھویں صدی ہجری کے مشہور عالم ومصلح شیخ الاسلام حافظ ابن تیمیہ کے سوانح حیات، ان کے صفات وکمالات، انکی علمی وتصنیفی خصوصیات، ان کا تجدیدی واصلاحی کام اور مقام اور انکی اہم تصنیفات کا مفصل تعارف اور انکے ممتاز تلامذہ اور منتسبین کے حالات، مرتبہ مولانا سید ابوالحسن علی ندوی، قیمت ہے

"منیجر"

فارابی کی منطق

از
جناب شبیر احمد خاں صاحب غوری ایم اے، ایل ایل بی، بی ٹی ایچ، رجسٹرار امتحانات عربی و فارسی یوپی

(۳)

مسلمانوں میں منطق کا آغاز

قرآن اور جدلیات کی ہمت افزائی اسلام ایک مکمل، جامع اور معقول نظام حیات لے کر مبعوث ہوا جس کی اشاعت کے لیے وہ ایک معقول، موثر اور دلنشین پیرایۂ بیان پر زور دیتا ہے، یہ پیرایۂ بیان جسے وہ خود بھی استعمال کرتا ہے اور جس کے استعمال پر اپنے متبعین کو بھی مامور کرتا ہے، نہ صرف دل کش اور دلنشین اور اقناعی ہے، بلکہ برہانی بھی ہے، اور علم البرہان کے ان قواعد و قوانین کی مراعات پر مشتمل ہے جو فطرت انسانی کے مطالعہ سے آج تک دریافت ہو سکے ہیں یا آئندہ دریافت ہوں گے، قرآن کہتا ہے،

لَقَدْ اَرْسَلْنَا رُسُلَنَا بِالْبَیِّنٰتِ وَ	ہم نے بھیجے ہیں اپنے رسول نشانیاں دیکر اور
اَنْزَلْنَا مَعَهُمُ الْكِتٰبَ وَالْمِیْزَانَ لِیَقُوْمَ	اتاری ان کے ساتھ کتاب اور ترازو تاکہ لوگ
النَّاسُ بِالْقِسْطِ (الحدید)	سیدھے رہیں انصاف پر،

یہ میزان حسب توجیہ امام غزالی اللہ تعالیٰ، اس کے ملائکہ، کتب اور رسولوں کی معرفت کی میزان ہے،[1]

[1] رسالۃ القسطاس المستقیم مشمولہ الجواہر الغوالی من رسائل الامام حجۃ الاسلام الغزالی ص ۱۵۸

علمائے ربانی نے اپنی بصیرت ایمانی سے ان موازین معرفت کو قرآن سے مستنبط کیا ہے، چنانچہ امام غزالی "وَزِنُوْا بِالْقِسْطَاسِ الْمُسْتَقِیْمِ" میں جس قسطاس مستقیم کا ذکر ہے، اس کے بارے میں فرماتے ہیں،

هی الموازین الخمس التی انزلها	قسطاس مستقیم ان موازین پنجگانہ کا نام ہے جنھیں
الله فی کتابه وعلم انبیاءه الوزن	اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب میں اتارا ہے اور اپنے
بها، فمن تعلم من رسول الله صلی الله	پیغمبروں کو ان سے وزن کرنا سکھایا ہے، پس
علیه وسلم ووزن بمیزان الله فقد	جس نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے انھیں سیکھا اور
اهتدی ومن ضل عنها الی الرای	اللہ تعالیٰ کی میزان سے اور انھیں وزن کیا تو اس نے
والقیاس فقد ضل وتردی[1]	ہدایت پائی اور جو ان سے بھٹک کر رائے اور قیاس
	کی طرف مائل ہوا تو وہ گمراہ ہوا اور بھٹکتا پھرا،

قرآن نے اس منطقی اسلوب اور معقول پیرایۂ بیان کی نہ صرف خود رعایت رکھی ہے، بلکہ اپنے متبعین سے بھی اس کا مطالبہ کیا ہے کہ وہ اپنے جملہ اعمال تفکر و رویت میں ان موازین قرآنی کی رعایت کریں، وہ انھیں ایجابی طور پر مامور کرتا ہے:

وَزِنُوْا بِالْقِسْطَاسِ الْمُسْتَقِیْمِ (بنی اسرائیل)	اور تولو سیدھی ترازو سے

اور اس راست اندیشی اور "استقامت فی التفکیر" سے بھٹکنے کو وہ ممنوع قرار دیتا ہے،

اَنْ لَا تَطْغَوْا فِی الْمِیْزَانِ وَاَقِیْمُوا	کہ زیادتی نہ کرو ترازو میں اور سیدھی ترازو تولو
الْوَزْنَ بِالْقِسْطِ وَلَا تُخْسِرُوا الْمِیْزَانَ (رحمن)	انصاف سے اور مت گھٹاؤ تول کو،

اسی طرح وہ بتاتا ہے کہ معقول اور منطقی پیرایۂ بیان (حسن مجادلہ) انبیائے سابقین کا اسوۂ حسنہ ہے، حضرت نوح علیہ السلام نے اپنی قوم سے پیغام الٰہی کی حقانیت کے باب میں بحث و مناظرہ

[1] رسالۃ القسطاس المستقیم مشمولہ الجواہر الغوالی من رسائل الامام حجۃ الاسلام الغزالی ص ۱۵۷

کیا اور اس خوش اسلوبی سے یہ فریضہ ادا کیا کہ وہ لاجواب ہو کر مکابرہ پر اتر آئے، قرآن ان کے قول کو دہراتا ہے:

قَالُوا يَا نُوحُ قَدْ جَادَلْتَنَا فَأَكْثَرْتَ — بولے اے نوح تو نے ہم سے جھگڑا کیا اور بہت
جِدَالَنَا فَأْتِنَا بِمَا تَعِدُنَا إِنْ كُنْتَ — جھگڑ چکا، اب لے آ جو وعدہ کرتا ہے ہم سے
مِنَ الصَّادِقِينَ (ھود) — اگر تو سچا ہے

جب حضرت ابراہیم علیہ السلام کے یہاں فرشتے مہمان ہوئے اور انھیں معلوم ہوا کہ وہ قوم لوط کو تباہ کرنے جارہے ہیں تو انھوں نے اس کے بارے میں فرشتوں سے بحث و مباحثہ کیا، قرآن کہتا ہے:

فَلَمَّا ذَهَبَ عَنْ إِبْرَاهِيمَ الرَّوْعُ — پھر جب جاتا رہا ابراہیم سے ڈر اور آئی اسکو خوشخبری
وَجَاءَتْهُ الْبُشْرَىٰ يُجَادِلُنَا فِي قَوْمِ لُوطٍ (ہود) — جھگڑنے لگا ہم سے قوم لوط کے حق میں،

قرآن حضرت ابراہیم کے اس مجادلہ کو بنظر ناپسندیدگی نہیں دیکھتا، کیونکہ وہ فوراً اس آیت کے بعد کہتا ہے:

إِنَّ إِبْرَاهِيمَ لَحَلِيمٌ أَوَّاهٌ مُنِيبٌ — البتہ ابراہیم تحمل والا نرم دل ہے رجوع رہنے والا

قرآن اسی بالواسطہ تعلیم پر اکتفا نہیں کرتا بلکہ وہ براہ راست اپنے متبعین کو "حسن مجادلہ" کے ایجابی حکم کے ساتھ مامور کرتا ہے:

ادْعُ إِلَىٰ سَبِيلِ رَبِّكَ بِالْحِكْمَةِ وَ — بلا اپنے رب کی راہ پر پکی باتیں سمجھا کر اور نصیحت
الْمَوْعِظَةِ الْحَسَنَةِ وَجَادِلْهُمْ — سنا کر بھلی طرح اور الزام دے ان کو جس
بِالَّتِي هِيَ أَحْسَنُ (النحل) — طرح بہتر ہو

چنانچہ بحث و نظر اور افہام و تفہیم کو اسلامی معاشرے میں شروع ہی سے مقبولیت حاصل

رہی ہے، تاریخ میں ایسے واقعات بھی ملیں گے کہ دو مسلمان عشا کی نماز پڑھ کر نکلے تھے کہ کسی مسئلے میں مناظرہ چھڑ گیا اور مسجد کے دروازے ہی پر فجر کی اذان ہوگئی، غرض علما و فقہا نے قرآنی تعلیمات سے حجج عقلیہ کے استعمال کو مستنبط کرکے اس کے استحسان پر زور دیا، مثلاً آیۂ کریمہ

فَإِنْ كُنْتُمْ فِي رَيْبٍ مِمَّا نَزَّلْنَا عَلَىٰ — اور اگر تم شک میں ہو اس کلام سے جو اتارا
عَبْدِنَا فَأْتُوا بِسُورَةٍ مِنْ مِثْلِهِ — ہم نے اپنے بندہ پر، تو لے آؤ ایک سورہ
وَادْعُوا شُهَدَاءَكُمْ مِنْ دُونِ اللَّهِ — اس جیسی اور بلاؤ اس کو جو تمہارا مددگار
إِنْ كُنْتُمْ صَادِقِينَ (البقرہ) — ہو اللہ کے سوا اگر تم سچے ہو۔

سے امام ابوبکر جصاص الرازی حجج عقلیہ کے استعمال اور دلائل و براہین سے استدلال کے "امر" کو ثابت کرتے ہیں،

قال ابوبکر رحمہ اللہ وقد تضمنت — امام جصاص الرازی نے فرمایا ہے کہ یہ آیات توحید کے
ھذہ الآیات مع ما ذکرنا من التنبیہ — دلائل اور نبوت کے علاوہ جنکا ہم نے ذکر کیا ہے عقلی حجتوں
علی دلائل التوحید واثبات النبوۃ — اور انکے دلائل کیساتھ استدلال کے حکم (الامر) پر بھی
"الامر" باستعمال حجج العقول — مشتمل ہیں، اس سے ان لوگوں کا مذہب باطل ہو جاتا ہے
والاستدلال بدلائلھا — جو اللہ تعالیٰ کی دلیلوں کی نفی کرتے ہیں اور انکے گمان
وذالک مبطل لمذھب من نفی — میں معرفت باری اور رسول اکرم صلی اللہ
الاستدلال بدلائل اللہ تعالیٰ — علیہ وسلم کی تصدیق کے بارے میں صرف
واقتصر علی الخبر بزعمہ فی معرفۃ — حدیث رسول ہی پر اقتصار کرتے ہیں،
اللہ والعلم بصدق رسول اللہ — لیکن ایسا نہیں ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے
صلی اللہ علیہ وسلم لان اللہ تعالیٰ لم — جو لوگوں کو اپنی توحید کی معرفت اور اپنے

یقتصر فیما دعا الناس الیه من
معرفة توحیدہ وصدق رسولہ
علی الخبر دون اقامة دلالته
علی صحته من جهة عقولنا[1]

رسول کی تصدیق کی جانب دعوت دی ہے
اس میں صرف خبر ہی پر اقتصار نہیں کیا بلکہ
انسانی عقول کی جانب سے اس کی صحت پر
مبنی دلائل کے قائم کرنے کا بھی حکم دیا ہے،

منشائے تعلیمات قرآنی کا تحقق اولین اللہ کے رسول کی ذات میں ہوا جس نے انھیں افصح العرب بنادیا، جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے وہ ارشادات گرامی جو صناعۃ منطق کی جانب مشیر تھے، انھیں اکثر علماء نے مدون کیا، ابو نصر فارابی نے بھی انھیں ایک کتاب میں جمع کیا جس کا نام ابن ابی اصیبعہ نے حسب ذیل بتایا ہے،

"کلام جمعه من اقاویل النبی صلی اللہ علیه وسلم یشیر فیه الی صناعة المنطق"[2]

اسلام کی ان تعلیمات کا فطری نتیجہ یہ ہوا کہ اکابر علمائے اسلام میں منطق کو ہمیشہ مقبولیت حاصل رہی، چنانچہ حجۃ الاسلام امام غزالی مقاصد الفلاسفہ میں فرماتے ہیں:

واما المنطقیات فاکثرها علی
منهج الصواب الخطأ نادر فیها[3]

رہے منطقی مسائل تو ان کا اکثر و بیشتر حصہ صحت
و صواب کے نہج پر ہے اور ان میں غلطی شاذ و نادر ہوتی ہے،

یہی نہیں بلکہ حصول سعادت اور تزکیہ و تحلیہ روح کے لیے وہ منطق کو ایجابی طور پر ضروری سمجھتے ہیں،

فاذا فائدة المنطق اقتناص العلم
وفائدة العلم حیازة السعادة
الابدیة فاذا صح رجوع السعادة
الی کمال النفس بالتزکیة والتحلیة

پس منطق کا فائدہ علم کا حاصل کرنا ہے اور علم کا
فائدہ ابدی سعادت کی ذخیرہ اندوزی ہے،
پس اگر یہ بات صحیح ہو کہ سعادت کمال نفس پر موقوف
ہے، جو تزکیہ و تحلیہ روح سے حاصل ہوتا ہے تو یقیناً

[1] احکام القرآن للجصاص الرازی جلد اول ص ۲۲-۲۳ [2] عیون الانباء ج ۲ ص ۱۳۹ [3] مقاصد الفلاسفہ ص

صار المنطق لا محالة عظیم الفائدة[1]

منطق بہت بڑے فائدے کی چیز ہے،

ان سے پہلے ابن حزم اندلسی نے خصوصیت سے ارسطاطالیسی منطق کے متعلق لکھا تھا:

والکتب الذی جمعها ارسطاطالیس
فی حدود الکلام ..... کلها کتب
سالمة مفیدة دالة علی توحید اللہ
عزوجل وقدرته عظیمة المنفعة
فی انتقاد جمیع العلوم[2]

اور جن کتابوں کو ارسطاطالیس کے بارے میں
جمع کیا ہے ...... وہ سب کتابیں بہت مفید
ہیں جو اللہ تعالیٰ کی توحید اور قدرت پر دلالت
کرتی ہیں اور عام علوم کے پرکھنے میں بہت زیادہ
نفع بخش ہیں۔

غالباً یہی وجہ تھی کہ جونہیں عہد عباسی میں غیر زبانوں سے علوم و فنون کی کتابیں عربی میں منتقل کرنے کی تحریک شروع ہوئی، فن منطق کو عربی میں منتقل کرنے پر خصوصیت سے توجہ دی گئی اور لوگوں میں منطق کے ساتھ غیر معمولی شغف و انہماک بڑھ گیا، لیکن اسلام ایک ایسی قوم میں مبعوث ہوا تھا، جو چند مستثنیات کو چھوڑ کر نہ کتابت سے واقف تھے نہ کتابت سے، اس لیے یہ معلوم کرنا خالی از دلچسپی نہ ہوگا کہ ایسی امی محض قوم نے منطق و فلسفہ سے شناسائی بہم پہنچانے سے پہلے ثقافت کی منازل کو کس طرح طے کیا،

مسلمانوں میں علوم و فنون کی تدوین کا آغاز

عربی زبان میں پہلی کتاب جو مدون ہوئی وہ "اللہ کی کتاب" تھی، قرآن مجید عہد رسالت میں جمع ہو کر مرتب اور عہد صدیقی میں کتابی صورت میں مدون ہوا، عہد عثمانی میں اس کی باضابطہ نقول ممالک اسلامیہ میں بھیجی گئیں، عرصہ تک عرب میں "کتاب اللہ" کے علاوہ اور کوئی کتاب نہیں تھی، بعض صحابہ کرام مثلاً حضرت انسؓ بن مالک، عبد اللہ بن عمروؓ بن عاص، ابوہریرہ، عبد اللہ بن عباس، علی بن ابی طالب رضوان اللہ علیہم اجمعین

[1] مقاصد الفلاسفہ ص ۳ [2] الفصل فی الملل والنحل جلد دوم ص ۹۵

کے پاس احادیث رسول کے مجموعے تھے، جو انھوں نے اپنی یادداشت کے لیے لکھ لیے تھے،

دیگر علوم میں سب سے پہلے امیر معاویہ رضی اللہ عنہ نے عبید بن شریہ کو یمن سے بلا کر تاریخ پر کتابیں لکھنے کا حکم دیا، اس کی دو کتابیں مشہور ہیں، کتاب الامثال اور کتاب الملوک و اخبار الماضین[1]، دوسرے مشہور مورخین صحار العبدی، عوانہ بن الحکم، حماد وغیرہ تھے، زیادہ بن ابیہ نے جو امیر معاویہ کے زمانہ میں عراق کا گورنر تھا، اپنے بیٹے کے لیے سب سے پہلے عرب کے عیبوں اور اخلاقی کمزوریوں پر "مثالب العرب" نام سے کتاب تصنیف کی[2]،

اسی زمانہ میں علم نحو ایجاد ہوا، اس کا بانی ابو الاسود دئلی تھا، اس نے حضرت علیؓ کے ایماء سے اسے مدون کیا، اس سے یحییٰ بن یعمر، عنبسہ بن معدان الفیل، میمون بن الاقرن، نصر بن عاصم وغیرہ نے اس علم کو سیکھا، یہ ایک تاریخی حقیقت ہے، مگر ڈاکٹر دی. بوائر کا پندار قومی اسے اس کے باور کرنے میں مانع ہے، چنانچہ لکھتا ہے:

"اہل عرب شل اور بہت سے علوم کے علم لسان کا بانی بھی علی نحو کو قرار دیتے ہیں، بلکہ ارسطو کی ایجاد کردہ کلام کی تین اجزا میں تقسیم بھی ان ہی کی طرف منسوب کی جاتی ہے[3]......

...... ابن المقفع نے جو خلیل نحوی کا دوست تھا، پہلوی زبان میں منطق اللسان پر جو کچھ موجود تھا، سب کا عربی میں ترجمہ مہیا کر دیا[4]"

خلیل بن احمد سے قبل نحاۃ عرب کے متعدد طبقات گزر چکے تھے، مگر دی بوائر ہمیں باور کرانا چاہتا ہے کہ خلیل نے ابن المقفع سے "باری ارمینیاس" کا مضمون لے کر سیبویہ کو پڑھایا!!

بہرحال نحو کی ایجاد و ترقی عرب عبقریت کا منطق کی جانب پہلا قدم تھا، یہ عربوں کا قابل فخر کارنامہ تھا جس پر انھوں نے ہمیشہ فخر کیا، چنانچہ سنہ ۳۲۰ھ میں وزیر ابن الفرات کے مکان پر ابو سعید

[1] الفہرست لابن الندیم ص ۱۳۲، [2] ایضاً ص ۱۳۱، [3] تاریخ فلسفۂ اسلام دی بوائر ص ۲۸، [4] ایضاً ص ۲۵

سیرافی نحوی اور ابوبشر متیٰ منطقی کے درمیان جو نحو و منطق کی افضلیت کے باب میں مناظرہ ہوا تھا، اس میں ابو سعید نحوی نے کہا تھا،

والنحو منطق ولکنہ مسلوخ من العربیۃ	نحو منطق ہے مگر وہ عربی سے ماخوذ ہے اور منطق
والمنطق نحو ولکنہ مفہوم باللغۃ[1]	نحو ہے، مگر وہ لغت سے اخذ کی گئی ہے،

اس لیے نحاۃ کی قومی و لسانی خودداری دوسری زبان کے تفوق کے اعتراف کی کس طرح اجازت دے سکتی تھی، چنانچہ اسی مناظرے میں ابو سعید نے ابوبشر متیٰ سے کہا تھا:

اذا کان المنطق وضعہ رجل	جبکہ منطق ایک یونانی شخص کی ایجاد ہے جس نے
من یونان علی لغۃ اھلھا واصطلاحھم	اسے اپنی قوم کی زبان و مصطلحات نیز ان
علیھا وما یتعارفونہ بھا من رسومھا	رسوم و صفات کی بنیاد پر جو ان میں مشہور
وصفاتھا من این یلزم الترک	تھیں مدون کیا، تو ترکوں، ہندیوں، ایرانیوں
والھند والفرس والعرب ان	اور عربوں پر یہ بات کس طرح ضروری ہو سکتی
ینظروا فیہ ویتخذوہ حکماً لھم	ہے کہ اس کا مطالعہ کریں اور اسے اپنے
وعلیھم وقاضیا بینھم ما شھد لہ	اوپر حاکم بنا لیں، یعنی جس بات کی وہ شہادت
قبلوہ وما انکرہ نفضوہ[2]	دے اسے مان لیں اور جس کا انکار کرے اسے چھوڑ دیں،

لیکن یہ لسانی خودداری زیادہ عرصے تک باقی نہ رہ سکی، منطق کی دلکشی نے بہت سے نحویوں کو اپنی طرف متوجہ کر لیا، چنانچہ ابوبکر ابن السراج جو مبرد اور زجاج کا شاگرد رشید تھا، فارابی سے منطق پڑھا کرتا تھا اور اسے نحو پڑھایا کرتا تھا، ابن ابی اصیبعہ کہتا ہے،

ان الفارابی کان یجتمع بابی بکر بن	فارابی ابوبکر بن السراج کے ساتھ بیٹھا کرتا تھا،

[1] معجم الادبا یاقوت جلد سوم صفحہ ۱۱۱ [2] ایضاً ص ۱۰۸

السراج فیقرأ علیہ صناعة النحو وابن السراج یقرأ علیہ صناعة المنطق[1]

اور اس سے نحو پڑھا کرتا تھا اور ابوبکر بن السراج فارابی سے منطق پڑھا کرتا تھا،

بلکہ اسی کی خاطر ابن السراج پڑھی پڑھائی ہوئی نحو بھی بھول گیا، ایک دن زجاج کی مجلس میں ابن السراج نے جب ایک نحو کے مسئلہ کا غلط جواب دیا اور زجاج ناراض ہوا تو ابن السراج نے معذرت میں کہا:

انا ما درسته ما درست منذ قرأت هذا الکتاب یعنی کتاب سیبویہ لانی تشاغلت عنہ بالمنطق والموسیقی[2]

جو کچھ آپ نے مجھے پڑھایا میں نے اسے کتاب سیبویہ کے پڑھنے کے بعد سے بھلا دیا، کیونکہ اس عرصہ میں منطق اور موسیقی میں مشغولیت کی وجہ سے میں نے نحو سے بالکل ہی بے تعلقی برتی

اور بعد میں تو منطق کا رنگ نحو پر اتنا غالب آنے لگا کہ متاخرین کی نحو کی کتابوں پر منطق کا اطلاق زیادہ صحیح ہے، اس کی بین مثال شرح جامی اور اس کے حواشی ہیں۔

منطق یا منطقی انداز تفکیر کی جانب عرب عبقریت کا دوسرا قدم علم کلام کی ایجاد تھا، جس کی بنیاد پہلی صدی کے سرے پر بنائی جاتی ہے، چنانچہ حافظ ابن تیمیہ نے عبد اللہ بن سلام البیکندی سے نقل کیا ہے، "یرون ان اول من تکلم جہم بن صفوان"۔ لوگوں کی رائے ہے کہ سب سے پہلے جس نے علم کلام پر گفتگو کی، وہ جہم بن صفوان تھا۔

لیکن اس سے کلام بالمعنی الاخص (نفی صفات باری و مقالۂ تعطیل) مراد ہے، ورنہ کلام اصطلاحی کی بنیاد اس سے بہت پہلے پڑ چکی تھی، اور کلامی تفکیر کے قدیم ترین نمایندے معتزلۂ اولین تھے، ان کا قدیم تر رکن جس کے کام سے ہم واقف ہیں واصل بن عطا ہے[3]۔ واصل نے ۱۳۱ھ میں وفات پائی، اس نے متعدد کتابیں تصنیف کی تھیں، مثلاً کتاب الخطب فی التوحید والعدل، کتاب المنزلة بین المنزلتین،

[1] طبقات الاطبا، لابن ابی اصیبعہ جلد دوم ص ۱۳۶، [2] الفہرست لابن الندیم ص ۹۲ [3] تفصیل کے لیے دیکھیے علمائے ہند کی کلامی خدمات، شائع کردہ برہان نومبر ۱۹۵۵ء ص ۲۷۴

کتاب اصناف المرجئة، کتاب السبیل الی معرفة الحق وغیرہ[1]

واصل ہی حسب تصریح ابو ہلال العسکری اصول فقہ کا بانی ہے، جو منطقی استدلال و استشہاد کی جانب عرب عبقریت کا تیسرا قدم ہے، وہ کتاب الاوائل میں لکھتا ہے،

وھو اول من قال الحق یعرف من وجوہ اربعة کتاب ناطق وخبر مجتمع علیہ وحجة عقل واجماع من الامة[2]

اور سب سے پہلے واصل ہی نے بتایا تھا کہ حق چار طریقوں سے معلوم کیا جاتا ہے۔ قرآن، حدیث، قیاس عقلی اور اجماع امت،

غیر زبانوں سے ترجمہ کی ابتدا

لیکن منطق و فلسفہ کی جانب عبقریت کا باقاعدہ قدم یونانی علوم و فنون کی کتابوں کے ترجمے کے سلسلے میں اٹھا۔

مسلمانوں کو پہلی صدی کے ربع اول ہی سے یونانی علوم کے ماہرین سے تبادلۂ خیالات کا موقع ملا، ۱۶ھ میں مصر فتح ہوا، اس وقت اسکندریہ یونانی فلسفہ کا آخری گہوارہ تھا، جہاں مشہور فلسفی یحیی النحوی مدرسہ اسکندریہ کا صدر تھا، وہ فاتح مصر حضرت عمرو بن عاصؓ سے ملنے آیا، وہ اس کی توحید آمیز گفتگو اور ابطال تثلیث کے دلائل سن کر بہت محظوظ ہوئے[3]، اس کے بعد خلفاء و امراء کے درباروں میں حکما، و اطباء کو تقرب حاصل ہونے لگا، مثلاً ابو الحکم نصرانی امیر معاویہؓ کا طبیب خاص اور ابن آثال ان کا معتمد علیہ تھا، حجاج بن یوسف کا طبیب خاص تیاذوق تھا، اور حضرت عمر بن عبد العزیزؒ کے دربار کا مشہور طبیب عبد الملک ابن ابجر (ابن الجر) الکنانی تھا، جو اس سے پیشتر اسکندریہ میں تعلیم و تعلم کے فرائض انجام دے چکا تھا،

[1] الفہرست لابن الندیم تکملہ ص ۱ [2] کتاب الاوائل لابی ہلال العسکری (مخطوطہ پیرس)، ص ۹۵ بحوالہ مذہب الذرة عند المسلمین ص ۱۲۴ [3] اخبار العلماء باخبار الحکماء لابن القفطی ص ۲۳۲

غرض خلفاء وامراء کے درباروں میں حکماء واطباء مصاحب خاص اور مقرب بارگاہ بنے ہوئے تھے، ان کی ترغیب یا نشاندہی سے انھوں نے یونانی علوم کی کتابوں کو عربی میں ترجمہ کرایا، اس تحریک کا آغاز یزید کے بیٹے خالد نے کیا، اسے کیمیا سے خاص شغف تھا، اور اس کے شوق میں اس نے یونانی زبان سے اس فن کی کتابوں کو عربی میں ترجمہ کرایا، ابن الندیم کہتا ہے،

كان خالد بن يزيد بن معاوية يسمّى حكيم آل مروان...... خطر بباله الصنعة فامر باحضار جماعة من فلاسفة اليونانيين ...... وامرهم بنقل الكتب ......الى العربي وهذا اول نقل كان في الاسلام[1]

خالد بن یزید بن معاویہ حکیم آل مروان کے نام سے ملقب تھا...... اس کے دل میں کیمیا کا شوق دامنگیر ہوا تو اس نے یونانی فلاسفہ کی ایک جماعت کو حاضر کرنے کا حکم دیا...... اور انھیں کتابیں...... عربی میں ترجمہ کرنے کا حکم دیا، اور یہ تاریخ اسلام میں پہلا موقع ہے کہ کتابوں کا ترجمہ ہوا،

خالد کا مترجم خاص اصطفن تھا، کچھ عرصے بعد دیوان خراج بھی فارسی اور رومی زبان سے عربی میں منتقل ہوگیا، ورنہ پہلے مشرقی ممالک کے دیوان کا کام فارسی میں اور مغربی ممالک کا رومی زبان میں ہوتا تھا، حجاج بن یوسف کے زمانہ میں صالح بن عبد الرحمٰن نے فارسی دیوان کو عربی میں منتقل کیا، ادھر مغربی ممالک کے دیوان کو جو سرجون رومی کے زیر اہتمام تھا، ہشام اموی کے زمانہ میں ابوثابت سلیمان بن سعد نے رومی زبان سے عربی میں منتقل کیا، اس سے عربی زبان کی اہمیت بڑھ گئی اور آئندہ ترجمہ کے لیے زمین ہموار ہوگئی،

حضرت عمرؓ بن عبد العزیز نے طب کی ایک کتاب کا محض نفع رسانی خلق کے لیے عربی میں ترجمہ

---

[1] الفہرست لابن الندیم ص ۳۳۸

کرایا، ہشام بن عبد الملک کے زمانہ میں فارسی زبان کی کچھ کتابیں ملیں، انھیں عربی میں منتقل کرایا گیا، ہشام کا کاتب ابو العلاء سالم تھا جو مشہور کاتب عبد الحمید بن یحییٰ کا داماد تھا، اس نے ان رسائل کا جو ارسطاطالیس نے سکندر کو لکھے تھے، عربی میں ترجمہ کیا،

سالم ويكنى ابا العلاء كاتب هشام بن عبد الملك..... وقد نقل من رسائل ارسطاطاليس الى الاسكندر[1]

سالم جس کی کنیت ابو العلاء تھی، وہ ہشام ابن عبد الملک کا کاتب تھا...... اس نے ارسطاطالیس کے ان رسالوں کو جو اس نے اسکندر کو لکھے تھے، عربی میں ترجمہ کیا،

غالباً اسی زمانہ میں قاطیغوریاس ارسطو کا سب سے پہلی مرتبہ ترجمہ ہوا، اگرچہ اس کا مترجم مجہول ہے، تفصیل آگے آرہی ہے،

عباسی خلافت کا آغاز اور علوم وفنون کی سرپرستی

۱۳۲ھ میں اموی حکومت کے بجائے عباسی حکومت قائم ہوئی، یہ محض حکمراں خاندانوں کی تبدیلی نہ تھی، بلکہ ایک ثقافتی انقلاب تھا، "عرب کے سوز دروں" پر "عجم کے حسن طبیعت" کے غلبہ کا آغاز تھا، اس انقلاب کے دورس اثرات نے ملک کے ثقافتی مزاج پر غیر معمولی اثر کیا، عباسی خلفاء عجمیوں کی مدد سے برسر اقتدار آئے تھے، ان کی تخت نشینی خسرو انوشرواں کی حکومت کا گویا احیا، اور ایک ثقافتی انقلاب تھا جس کے نتیجے میں حکومت کی سرپرستی میں علم وحکمت کے ساتھ باقاعدہ اہتمام واعتناء شروع ہوا،

پہلا عباسی خلیفہ ابو العباس سفاح ۱۳۶ھ میں مرگیا، اس کے بعد اس کا بھائی ابوجعفر منصور خلیفہ ہوا، جس کے عہد حکومت میں باقاعدہ تصنیف وتالیف کا آغاز ہوا، سیوطی نے ذہبی سے نقل کیا ہے،

---

[1] الفہرست ص ۱۷۱

قال الذهبی فی سنة ثلث واربعین ومائة شرع علماء الاسلام فی هذا العصر فی تدوین الحدیث والفقه والتفسیر..... وکثر تدوین العلم وتبویبه ودونت کتب العربیة واللغة والتاریخ وایام الناس[1]

ذہبی نے کہا ہے کہ ۱۴۳ھ میں علمائے اسلام نے حدیث، فقہ اور تفسیر کو مدون کرنا شروع کیا.......... اس طرح علوم کی تدوین و تبویب بڑھنے لگی، اس کے علاوہ عربیت، لغت، تاریخ، اور ایام الناس پر کتابیں لکھی گئیں،

منصور ہی نے قیصر روم سے یونانی علوم کی کتابیں منگائیں جس سے فلسفہ و حکمت کے تعلیم و تعلم کے لیے اہل ملک کا شوق بڑھنے لگا، ابن خلدون کہتا ہے:

فبعث ابوجعفر المنصور الی ملک الروم ان یبعث الیه بکتب التعالیم مترجمة فبعث الیه بکتاب اقلیدس وبعض کتب الطبیعیات فقرأها المسلمون واطلعوا علی ما فیها وازدادوا حرصاً علی الظفر بما بقی منها[2]

ابوجعفر منصور نے قیصر روم کو ریاضی کی کتابیں ترجمہ کرا کے بھیجنے کے لیے لکھا تو اس نے اصول اقلیدس اور طبیعیات کی کچھ کتابیں بھیجیں، جنھیں مسلمانوں نے پڑھا، اور ان کے مضمون پر واقفیت حاصل کی، اس سے باقی کتابوں کے حاصل کرنے کے لیے ان کا شوق اور بڑھ گیا،

ابن خلدون سے پہلے قاضی صاعد نے طبقات الامم میں لکھا تھا:

فکان اول من اعتنی (بنی العباس) بالعلوم الخلیفة الثانی ابوجعفر المنصور ..... فکان رحمه الله تعالی

عباسیوں میں سے پہلا شخص جس نے علوم حکمیہ کے ساتھ اعتنا کیا وہ دوسرا عباسی خلیفہ ابوجعفر منصور تھا........ وہ فقہ میں براعت و مہارت

[1] تاریخ الخلفاء ص ۱۶۷ [2] مقدمہ ابن خلدون ص ۴۰۱

مع براعته فی الفقه وتقدمه فی علم الفلسفة وخاصة فی علم صناعة النجوم کلفاً بها وباهلها[1]

اور فلسفہ میں متبحر بالخصوص نجوم میں کمال رکھنے کے ساتھ ساتھ ان علوم کے ماہرین و متبحرین کی سرپرستی کرتا تھا،

ارسطاطالیسی منطق کے ترجمہ کا آغاز

علوم حکمیہ میں سے سب سے پہلے منطق و نجوم کے ساتھ اعتنا کیا گیا، اور منصور کے زمانہ میں ارسطاطالیسی منطق کا سب سے پہلے ترجمہ ہوا، قاضی صاعد نے لکھا ہے،

ان اول علم اعتنی به من علوم الفلسفة علم المنطق والنجوم فاما المنطق فاول من اشتهر فی هذه الدولة عبد الله بن المقفع الخطیب الفارسی کاتب ابی جعفر المنصور فانه ترجم کتب ارسطاطالیس المنطقیة الثلاثة التی فی صورة المنطق وهی کتاب قاطاغوریاس وکتاب باری ارمیناس وکتاب انولوطیقا وذکروا انه لم یترجم منه الی وقته الا الکتاب الاول فقط وترجم ذلک المدخل الی کتاب المنطق

علوم فلسفہ میں سب سے پہلے منطق اور نجوم کے ساتھ اعتنا کیا گیا، اور منطق میں سب سے پہلا شخص جو تصنیف و تالیف کے لیے مشہور ہوا وہ عبد اللہ بن المقفع ہے جو مشہور ایرانی خطیب اور ابوجعفر منصور کا کاتب تھا، اس نے ارسطاطالیس کی منطقی کتابوں میں سے تین کتابوں کا جو منطق کی صورت (Form) کے متعلق ہیں، عربی میں ترجمہ کیا؛ یعنی قاطیغوریاس (کتاب المقولات)، باری ارمیناس (کتاب العبارۃ)، اور انالوطیقا (کتاب القیاس) اور کہا گیا ہے کہ اس کے زمانہ تک ان کتابوں میں سے صرف پہلی کتاب (قاطیغوریاس) کے سوا اور کوئی کتاب ترجمہ نہیں ہوئی تھی، اسی طرح اس نے کتب منطق کے مقدمے کو جو فرفوریوس صوری کے

[1] طبقات الامم ص ۵۰

المعروف بالایساغوجی لفرفوریوس الصوری[1] — ایساغوجی" کے نام سے مشہور ہے ترجمہ کیا۔

اس روایت کو ابن القفطی نے اخبار العلماء باخبار الحکماء میں اور ابن ابی اصیبعہ نے عیون الانباء فی طبقات الاطباء میں نقل کیا ہے،[2]

قاضی صاعد کی عبارت سے معلوم ہوتا ہے کہ باوجودیکہ عبداللہ بن المقفع کا مذکورہ بالا پہلا ترجمہ ہے جس کی تفصیلات تاریخ نے محفوظ رکھی ہیں، لیکن اولیت کا شرف کسی اور مجہول الحال مترجم کو حاصل ہے، جس نے اس سے بھی پہلے قاطیغوریاس (کتاب المقولات) کا ترجمہ کیا تھا، جیسا کہ ان کے الفاظ "لم یترجم منه الیٰ وقته الا الکتاب الاول" سے ظاہر ہے۔ اس طرح ہم فرض کر سکتے ہیں کہ منطق کا ترجمہ ۱۳۶ھ سے پہلے ہی ہونا شروع ہو گیا تھا، ممکن ہے دوسری صدی ہجری کے ربع اول میں ہو چکا ہو۔

دوسری صدی ہجری کے منطقی تراجم ارسطو کے لوقیون سے نکل کر مسلمانوں میں داخل ہونے سے پہلے منطق و فلسفہ نے تین منزلوں کو طے کیا: اسکندریہ کا وثنی مدرسہ، نساطرہ و یعاقبہ کی تبلیغی مساعی، ایرانی کتاب۔[3] عہد اسلام میں یہ ترتیب بدل گئی،

ا۔ طبقۂ کتاب (جو ایران کے طبقۂ کتاب (دبیران) کے جانشین تھے۔

ب۔ سرکاری مترجمین [جو نساطرہ و یعاقبہ کے جانشین تھے]

ج۔ اسکندریہ کے مشائی مدرسہ کے جانشین [جو فارابی کے پیشرو تھے]

ا۔ طبقۂ کتاب ارسطاطالیسی فلسفہ کو نسطوری مبلغوں نے مسیحیت کے ساتھ ساتھ ایران میں پھیلایا، جہاں دبیروں (کاتبوں) نے خصوصیت سے اسے سیکھا،[4] یہی لوگ عہد اسلام میں کتابت کے عہدوں

---

[1] طبقات الاطباء، ص ۷۷، [2] اخبار العلماء، لابن القفطی ص ۱۴۸، عیون الانباء لابن ابی اصیبعہ ج ۱ ص ۳۰۸
[3] تفصیل کے لیے دیکھیے معارف دسمبر ۱۹۵۸ء "فارابی کی منطق۔ دور عبوری" [4] مزید تفصیل کے لیے دیکھیے معارف جون ۱۹۵۸ء "یونانی منطق کے قدیم عربی تراجم" ص ۴۲۳-۴۴۴

پر فائز ہوئے، ان ہی لوگوں نے منطق و فلسفہ کو پہلوی تراجم سے محض تفنناً عربی میں منتقل کیا، ان غیر پیشہ ور مترجموں میں عبداللہ بن المقفع خصوصیت سے قابل ذکر ہے، ابن الندیم کہتا ہے:۔

وقد کان الفرس نقلت فی القدیم	اور ایرانیوں نے قدیم زمانے میں منطق اور طب
شیئاً من کتب المنطق والطب الی	کی بعض کتابوں کو فارسی (پہلوی) زبان میں
اللغة الفارسیة فنقل ذلک	ترجمہ کیا تھا، ان ترجمہ کتابوں کو عبداللہ بن
الی العربی عبداللہ بن المقفع وغیرہ[1]	المقفع وغیرہ نے عربی میں ترجمہ کیا۔

اوپر ذکر آ چکا ہے کہ جہاں تک تاریخ کی یادداشت کا تعلق ہے، سب سے پہلے عبداللہ بن المقفع نے ایساغوجی، قاطیغوریاس، باری ارمیناس اور انالوطیقا کا عربی میں ترجمہ کیا، غالباً اس نے یہ ترجمہ پہلوی تراجم سے کیا تھا۔[2] اس ترجمہ کا ایک بوسیدہ مخطوطہ سینٹ جوزف کالج بیروت میں ہے، جس کا نمبر ۳۳۸ ہے اور جو ۲۵۵ صفحات پر مشتمل ہے، تقریباً تیس سال ہوئے جو تر پہ فرلانی نے اس کا تعارف کرایا تھا، اس کی تصریح کے مطابق اس مخطوطہ کے آخر میں حسب ذیل توقیع ہے،

"تمت کتب الثلاثة من ترجمة محمد بن عبد اللہ المقفع وقد ترجمہا بعد محمد..."

اس سے فرلانی، فرانشسکو جبرئیلی اور پول کراؤس کو یہ شبہہ ہوا ہے کہ یہ ترجمہ عبداللہ بن المقفع کا نہیں بلکہ اس کے بیٹے محمد بن عبداللہ المقفع کا کیا ہوا ہے۔[3] میرے خیال میں توقیع کی تحریر میں کاتب نے بہت زیادہ تحریف کی ہے، غالباً محمد سے پہلے "ابی" چھوڑ دیا ہے، اور "بن" "عبداللہ کے بعد کے بجائے پہلے لکھ گیا ہے، اس لیے توقیع کی عبارت حسب ذیل ہوگی،[4]

"تمت الکتب الثلاثة من ترجمة ابی محمد عبد اللہ بن المقفع وقد ترجمہا بعد ابی محمد..."

---

[1] الفہرست ص ۲۴۴، [2] و [3] یونانی منطق کے قدیم عربی تراجم شائع شدہ معارف جون ۱۹۵۸ء ص ۴۲۳-۴۴۴ [3] التراث الیونانی فی الحضارۃ الاسلامیہ ص ۱۰۰، [4] تفصیل کیلئے دیکھئے معارف مئی ۱۹۵۸ء "یونانی منطق کے قدیم عربی تراجم" بالخصوص ص ۳۴۳-۳۴۶

اس ترجمہ کا دوسرا مخطوطہ کتب خانۂ آصفیہ حیدرآباد میں ہے، جس کا نمبر ۱۷۹ ہے، اور جس کا سال کتابت ۱۰۹۵ھ ہے، شاید یہ دونوں مخطوطے مشترک الاصل ہیں، کیونکہ دونوں میں مترجم کا نام ایک ہی سا ہے،

دوسری صدی میں منطق کے اور مترجم کتاب کی علمی خدمات سے ہم واقف نہیں ہیں، البتہ بعض کاتبوں کے متعلق خیال ہوتا ہے کہ انھوں نے منطق وحکمت میں خامہ فرسائی کی تھی، مثلاً ابوعمر کلثوم بن عمر التغلبی العتابی جو شام کا رہنے والا اور برامکہ کے متوسلین میں تھا، ابن الندیم اس کی تصانیف میں اس قسم کی دو کتابیں بتاتا ہے: کتاب فنون الحکم اور کتاب المنطق،[1]

اسی عہد کا دوسرا کاتب محمد بن اللیث الخطیب ہے، جو یحییٰ بن خالد کا کاتب تھا، بایں ہمہ وہ فقہ وکلام اور دیگر علوم میں بھی دستگاہ عالی رکھتا تھا، ابن الندیم کہتا ہے:

"محمد بن اللیث الخطیب ....کان بلیغاً مترسلاً کاتباً فقیہاً متکلماً بارعاً محارفاً"[2]

اس نے زنادقہ کے رد میں "کتاب الرد علی الزنادقہ" لکھی تھی، اس کی متکلمانہ سرگرمیوں کی وجہ سے خیال ہوتا ہے کہ وہ منطق سے بھی واقف تھا، اگرچہ تفصیل معلوم نہیں ہے،

ب۔ سرکاری مترجمین | اموی خلفاء کے دربار میں حکما، واطبا کو خصوصی تقرب حاصل تھا، عباسی دور میں بھی ان کا اثر علی حالہٖ باقی رہا، اس عہد کے مشاہیر اطبا، زیادہ تر جندی سابور سے آئے تھے جہاں ساسانی عہد کے آخر میں نوشیروان نے علم وحکمت کی درسگاہ قائم کی تھی، ساسانیوں کے زوال کے بعد غالباً اس مدرسہ پر بھی نسطوری عیسائیوں کا اثر قائم ہوگیا، منصور عباسی کے زمانہ میں بیمارستان جندی سابور کا رئیس الاطباء، جورجیس بن جبرئیل تھا، ۱۴۸ھ میں منصور بہت سخت بیمار ہوا، اسکے علاج کے لیے جورجیس کو جندی سابور سے بلایا گیا، خلیفہ کو اس کے علاج سے آرام ہوگیا، اور اس نے جورجیس کو بغداد ہی میں ٹھہرالیا، علاج معالجہ کے علاوہ منصور نے اس سے طبی کتابوں کا بھی عربی میں

۱؎ الفہرست ص ۱۷۰، ۲؎ ایضاً

ترجمہ کرایا،[1] اسی طرح جندی سابور کے اطبا کا دربار خلافت میں اثر شروع ہوا، ۱۵۲ھ میں جورجیس کو وطن جانے کی اجازت ملی، جہاں پہنچکر وہ راہی ملک عدم ہوا، مگر اس کا شاگرد عیسیٰ بن شہلا بغداد میں رہتا تھا،

۱۷۱ھ میں ہارون الرشید کو شدید درد سر لاحق ہوا، اس کے علاج کے لیے یحییٰ بن خالد نے پھر جندی سابور سے جورجیس کے بیٹے بختیشوع کو بلایا، یہ نسطوری اطبا، طبابت کے علاوہ فلسفہ ومنطق میں بھی ید طولیٰ رکھتے تھے، چنانچہ جب بختیشوع دربار میں پہنچا تو ہارون نے یحییٰ بن خالد کو جو خود منطقی تھا، حکم دیا کہ اس نووارد منطقی (بختیشوع) سے علمی گفتگو کرے، تاکہ اس کی منطق دانی کا اندازہ کرسکے، ابن ابی اصیبعہ لکھتا ہے،

وقال لیحیی بن خالد انت منطقی — ہارون نے یحییٰ بن خالد سے کہا تو منطقی ہو، لہذا
فتکالم معہ حتی اسمع کلامہ[1] — بختیشوع سے گفتگو کرتا کہ میں اکی باتیں سن سکوں،

مگر یحییٰ بن خالد نے کہا نہیں، بلکہ اطبائے دربار کو اس سے بات کرنے کے لیے کہا جائے، لیکن وہ لوگ اس کے لیے تیار نہ ہوئے، اور افسر الاطباء ابو قریش نے کہا

یا امیر المومنین! لیس فی الجماعۃ — اے امیر المومنین! اس جماعت (اطبا)
من یقدر علی الکلام مع ھذا لانہ — میں کوئی شخص ایسا نہیں ہے جو اس کے
کون الکلام وھو ابوہ وجنسہ — ساتھ بحث ومباحثہ کرسکے کیونکہ وہ اور اسکا
فلاسفۃ[2] — باپ اور دیگر اقربا فلسفی ہیں،

بہرحال اس معرکۃ الآرا علاج کو کامیابی کے ساتھ ختم کرلے کے صلے میں ہارون نے بختیشوع کو افسر الاطبا کا عہدہ عطا کیا،

۱؎ طبقات الاطباء، ج ۱ ص ۱۲۳، ۲؎ ایضاً ص ۱۲۶

۱۷۵ھ میں جعفر بن یحییٰ بن خالد ایک پیچیدہ مرض میں گرفتار ہوگیا کچھ دن بخت یشوع نے اس کا علاج کیا، بعد میں اپنے بیٹے جبرئیل کو اس کی سرکار میں ملازم کرادیا، وہاں سے ترقی کرکے وہ ہارون کا طبیب خاص ہوگیا، جبرئیل بن بخت یشوع اپنے زمانے کے متمول ترین انسانوں میں سے تھا، لیکن باہمہ دولت وثروت اسے علم وحکمت کی ترقی وسرپرستی سے عشق تھا، وہ خود زبردست منطقی تھا، اور طبابت کے علاوہ منطق میں بھی صاحب التصنیف تھا، تفصیل آگے آرہی ہے۔

جبرئیل کے بعد اس کا خاندان بڑے عزت واکرام سے دربار بغداد میں معالجہ کی خدمات انجام دیتا رہا، مگر علمی اعتبار سے بعد میں کسی کا نام سننے میں نہیں آتا، البتہ اس کے آبائی بیمارستان میں ماسویہ نام ایک معمولی عطار تھا، وہ تو زیادہ پڑھا لکھا نہ تھا، مگر اس کا بیٹا یوحنا بن ماسویہ مختلف علوم میں تبحر کے ساتھ ساتھ متعدد زبانوں میں مہارت تامہ رکھتا تھا، چنانچہ جب غزوۂ روم میں ہارون کو انقرہ اور عموریہ وغیرہ میں یونانی کتابیں ملیں تو اس نے ان کے ترجمہ کا کام یوحنا بن ماسویہ کے سپرد کیا،[۱] اس کے علم وفضل کے متعلق ابن ابی اصیبعہ کہتا ہے

کان مجلس یوحنا بن ماسویہ	بغداد میں طبیبوں، متکلمین اور فلسفیوں
اعمر مجلس کنت اراہ بمدینۃ	کی جتنی مجلسیں دیکھیں ان میں سب سے
السلام لمتطبب او متکلم او متفلسف	زیادہ آباد مجلس یوحنا بن ماسویہ کی تھی،
لانہ کان یجتمع فیہ کل صنف	کیونکہ اس میں اہل ادب کے گروہوں
من اصناف اھل الادب[۲]	میں سے ہر گروہ کے لوگ جمع ہوا کرتے تھے۔

طبابت کے ساتھ یوحنا بن ماسویہ فلسفہ بالخصوص منطق کی تعلیم وتدریس کا مشغلہ بھی جاری رکھتا تھا، چنانچہ ابن ابی اصیبعہ اس کے متعلق لکھتا ہے:

---

[۱] طبقات الاطباء ج ۱ ص ۱۷۵ [۲] ایضاً ص ۱۷۵ - ۱۷۶

واظھرت لہ التلمذ فی قراءۃ	اور اس کے شاگرد اس سے منطق کی
کتب المنطق علیہ[۱]	کتابیں پڑھنے کے لیے آئے۔

لیکن خلفاء سے زیادہ برمکی خاندان نے علم وفن کی ترقی میں حصہ لیا، ان کے عروج وزوال کی عبرت انگیز داستان اور علم وادب کی سرپرستی آفتاب نصف النہار کی طرح روشن ہے، انھوں نے مجسطی کا عربی میں ترجمہ کرایا، ان ہی کے لیے حجاج بن مطر نے سب سے پہلے اقلیدس کا ترجمہ کیا، انھوں نے دیگر ممالک میں علمی وتحقیقاتی وفود بھیجے، ہندوستان کے علما کو بلا کر ہندوستانی علوم کی کتابوں کا عربی میں ترجمہ کرایا، مگر اس کی تفصیل ہمارے موضوع سے خارج ہے، ہمیں صرف یہ دیکھنا ہے کہ دوسری صدی ہجری میں خلفاء وامراء کے اشارے سے منطق کی کتابوں کے ساتھ کہاں تک اعتنا کیا گیا،

منصور کا خاص مترجم البطریق تھا جس سے اس نے بعض قدیم کتابوں کا ترجمہ کرایا تھا، ابن الندیم مترجمین کی فہرست میں لکھتا ہے۔

البطریق وکان فی ایام المنصور	بطریق ابوجعفر منصور کے زمانہ میں تھا،
وامرہ بنقل اشیاء من الکتب	خلیفہ نے اسے بعض قدیم کتابوں کے
القدیمۃ[۲]	ترجمہ کا حکم دیا تھا،

ابن ابی اصیبعہ نے اس کے ترجمے دیکھے تھے، مگر یہ بقراط وجالینوس کی طب کی کتابوں کے ترجمے تھے، یہ نہیں معلوم کہ اس نے منطق کے سلسلے میں بھی کچھ کیا یا نہیں، منصور کے عہد خلافت میں صرف عبداللہ بن المقفع کا نام ملتا ہے، جس نے محض تفنناً اپنے شوق سے ارسطاطالیسی منطق کی پہلی تین کتابوں اور فرفوریوس کی ایساغوجی کا ترجمہ کیا تھا، (تفصیل اوپر گذری)

---

[۱] طبقات الاطباء جلد اول ص ۱۷۶ [۲] الفہرست ص ۳۴۴

منصور نے آزادی فکر و اظہار خیال کی جو اجازت دے رکھی تھی، وہ اس کے جانشین مہدی (۱۵۸ھ ۔ ۱۶۹ھ) کے زمانہ میں رنگ لائی۔ اس لیے اس کا عہد حکومت زنادقہ کے استیصال میں گزرا، اس نے متکلمین و اہل جدل کو بلا کر ملاحدہ کے رد میں کتابیں لکھوائیں، مسعودی کہتا ہے:

وَكَانَ المَهْدِي اول من امر	اور مہدی نے سب سے پہلے طبقہ،
الجدليين من اهل البحث من	متکلمین میں سے مناظروں کو بلا کر
المتكلمين بتصنيف الكتب	ملاحدہ کے رد میں کتابیں لکھوائیں
فی الرد علی الملحدين[1]	. . . .

مگر ان متکلمین کا انداز فقیہانہ تھا، اور مقابلہ ایسے لوگوں سے تھا، جو منطق و فلسفہ کے ماہر تھے، لہذا مہدی نے منطق کی کتابوں کا ترجمہ کرایا، اس کا مترجم ابو نوح کاتب تھا، اوپر ذکر آچکا ہے کہ عبد اللہ بن المقفع جن منطق کی کتابوں کا ترجمہ کیا تھا، اس کا ایک مخطوطہ بیروت میں ہے، اس کے آخر میں حسب ذیل توقیع ہے۔

تمت كتب الثلاثة من ترجمة محمد بن عبد الله المقفع وقد ترجمها

بعد محمد ابو نوح الكاتب النصرانی ثم ترجمها بعد ابی نوح سلمة الحرانی صاحب

بيت الحكمة ليحيیٰ بن خالد برمكی للبيت اور ... بعة كلها قبل هؤلاء

الترجمتين الذی تكسانی الملكانی النصرانی۔"

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ عبد اللہ بن المقفع کے بعد کتب منطقیہ کا ترجمہ ابو نوح کاتب نے کیا۔ اس نے یہ ترجمہ مہدی کے حکم سے کیا تھا اور شاید سریانی زبان سے کیا تھا، اس کی تصدیق اس خط سے ہوتی ہے جسے جاثلیق طیماتاؤس اول (Kalholicos Timotheos I) نے قیتیس فتیون کو

[1] مروج الذہب و معادن الجواہر ج ۴ ص ۱۰۴

بھیجا تھا، اس میں اس نے لکھا تھا،

"خلیفہ (المہدی) نے ہم کو ارسطو فلسفی کی کتاب طوبیقا کو سریانی سے عربی میں ترجمہ کرنے کا حکم دیا، اور بفضل خدا اس کام کو شیخ ابو نوح نے انجام دیا۔"

غرض مہدی کے ایما سے ابو نوح کاتب نصرانی نے سریانی زبان سے ارسطا طالیسی منطق کی چار کتابوں کا ترجمہ کیا تھا[1]

(۱) قاطیغوریاس، (۲) باری ارمینیاس (۳) انالوطیقا (۴) طوبیقا،

مخطوطہ بیروت کی توقیع میں ابو نوح کے بعد سلمہ (سلما) الحرانی کا ذکر ہے، جو بیت الحکمۃ ہارونی کا اُبر برین تھا، اس نے یہ ترجمہ یحییٰ بن خالد البرمکی کے ایما سے کیا تھا، جیسا کہ "ثم ترجمها بعد ابی نوح سلمة الحرانی صاحب بيت الحكمة ليحيیٰ بن خالد البرمكی" سے ظاہر ہے،

غالباً اس نے یہ ترجمہ براہ راست یونانی سے کیا تھا، سلما یونانی جانتا تھا، کیونکہ مامون الرشید نے قیصر روم سے فلسفہ و حکمت کی کتابیں منگانے کے لیے جو وفد بھیجا تھا، اس میں ابن الندیم سلما صاحب بیت الحکمہ کا خصوصیت سے ذکر کرتا ہے۔ نیز جب مجسطی کے تراجم یحییٰ بن خالد کو پسند نہ آئے تو اس نے یہ کام سلما اور ابو حسان کے سپرد کیا، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ سلما کو یونانی زبان میں تبحر حاصل تھا[2]

یحییٰ بن خالد البرمکی خود بڑا جید منطقی تھا، جب بخت یشوع ہارون کے علاج کے لیے دربار میں آیا تو ہارون نے یحییٰ سے کہا کہ "تو منطقی ہے، اس سے بحث کر" (تفصیل اوپر گذر چکی)

برامکہ کے علاوہ جن امرا نے منطق کے تراجم کی سرپرستی کی ان میں جبرئیل بن بخت یشوع کا نام خصوصیت سے قابل ذکر ہے، اس کا حال اوپر گذر چکا ہے، اس نے جالینوس کی "کتاب البرہان" کو

[1] تفصیل کے لیے دیکھئے معارف جولائی ۱۹۵۸ء "یونانی منطق کے قدیم عربی تراجم" ص ۳۹ - ۴۴ [2] ایضاً ص ۴۴ - ۴۵

تلاش کرایا، جو منطق کی بہت مشہور کتاب تھی، بعد تلاش بسیار چند مقالے دستیاب ہوئے جنھیں ایوب نے یونانی سے ترجمہ کیا، حنین بن اسحٰق جس نے خود اس کتاب کی تلاش میں زحمت بسیار برداشت کی تھی، لکھتا ہے:

ان جبرئیل قد کان عنی بطلبه عنایة	جبرئیل نے اس کتاب کی تلاش میں بہت زیادہ زحمت
شدید ثم طلبته انا بغایة الطلب ...	برداشت کی تھی اور میں نے بھی اسکی بہت زیادہ تلاش کی،
وقد کان جبرئیل ایضاً وجد منه مقالات	... جبرئیل کو اس کے کچھ مقالے مل گئے تھے جو بعینہٖ
لیست کلها المقالات التی وجدا باعیانها	وہی ہیں جو مجھے ملے، اسے جو مقالے ملے انکا
وترجم له ایوب ما وجد منها	ایوب نے ترجمہ کیا تھا،

جبرئیل خود بھی منطق میں ید طولیٰ رکھتا تھا، چنانچہ اطبائے دربار کو اس کے ساتھ علمی گفتگو کی ہمت نہیں ہو سکی جیسا کہ اوپر ذکر ہو چکا ہے، وہ اپنے فن کے علاوہ منطق میں بھی صاحب التصنیف تھا، اور اس کی مصنفات میں ابن ابی اصیبعہ نے منطق کی حسب ذیل کتاب کا ذکر کیا ہے:

كتاب المدخل الى صناعة المنطق ۔

ج۔ اسکندریہ کا مشائی مدرسہ | دوسری صدی ہجری میں مدرسہ اسکندریہ کی علمی مساعی، بالخصوص منطق کے نقل و ترجمہ کے سلسلے میں ان کی خدمات کا کہیں ذکر نہیں ملتا، صرف مسعودی نے اتنا حوالہ دیا ہے کہ خلیفہ عمر بن عبد العزیزؒ کے زمانہ میں فلسفہ کی مجلس تعلیم اسکندریہ سے انطاکیہ میں منتقل ہو گئی، مسعودی نے اس کے اسباب بھی "فنون المعارف وما جری فی الدهور السوالف" میں دیے تھے، مگر افسوس آج یہ کتاب ناپید ہے، البتہ اس کا حوالہ اس نے (مسعودی نے) کتاب التنبیہ والاشراف میں دیا ہے:

نقل التعلیم فی ایام عمر بن عبد العزیز	حضرت عمر بن عبد العزیزؒ کے زمانہ میں فلسفہ کی تعلیم
الاسکندریة الی انطاکیه ثم انتقاله	اسکندریہ سے انطاکیہ میں منتقل ہو گئی، پھر وہاں سے
الی حران فی ایام المتوکل[1]	متوکل باللہ (۲۳۲ - ۲۴۷) کے زمانہ میں حران میں منتقل ہو گئی،

[1] کتاب التنبیہ والاشراف ص ۱۲۲

یہی ابن ابی اصیبعہ نے عبد الملک بن ابجر [ابن الحجر] الکنانی کے ذکر میں لکھا ہے، جو اپنے زمانہ میں مدرسہ اسکندریہ کا متولی تدریس رہا تھا،

فلما افضت الخلافة الی عمر و	جب حضرت عمر بن عبد العزیزؒ خلیفہ ہوئے اور
ذالک فی سنة تسع وتسعین للهجرة	یہ ۹۹ھ کا واقعہ ہے تو فلسفہ کی تعلیم انطاکیہ
نقل التدریس الی انطاکیه وحران	اور حران میں منتقل ہو گئی، اور دوسرے شہروں
وتفرق فی البلاد[1]	میں پھیل گئی۔

مجلس تعلیم (مدرسہ مشائین) کے انطاکیہ سے حران منتقل ہونے کا واقعہ اگلی صدی سے تعلق رکھتا ہے، اس کی تفصیل آگے آئے گی، دوسری صدی ہجری میں انطاکیہ کا مدرسہ بڑی کس مپرسی کے عالم میں تھا، اور یہ کس مپرسی کا عالم بڑے عرصہ تک رہا، یہاں تک کہ وہاں صرف ایک ہی معلم رہ گیا، اس کے بعد اس کے شاگرد انطاکیہ میں ٹھہرے، وہاں سے حران اور کچھ دن حران میں رہنے کے بعد بغداد میں منتقل ہو گئے، چنانچہ ابن ابی اصیبعہ خود الفارابی سے نقل کرتا ہے،

فانتقل التعلیم من الاسکندریة	پھر فلسفہ کی تعلیم اسکندریہ سے انطاکیہ میں منتقل ہو گئی
الی انطاکیه وبقی بها زمنا طویلا	اور وہاں بہت زمانہ تک باقی رہی، یہاں تک کہ صرف
الی ان بقی معلم واحد فتعلم	ایک استاد باقی رہ گیا، اس سے دو شخصوں نے پڑھا
منه رجلان وخرجا ومعهما الکتب[2]	مگر انجام کار یہ لوگ لائبریری لیکر یہاں سے بھی منتقل ہو گئے،

اس کی تفصیل آگے آئے گی، بہرحال اسی مدرسہ مشائین (مجلس تعلیم) کے آخری تلامذہ میں سے فارابی تھا،

(باقی)

[1] طبقات الاطباء، جلد اول ص ۱۱۶

[2] " " جلد دوم ص ۱۳۵

قدیم وجدید شعراء اور ان کی شاعری

ایک مبسوط تبصرہ

از مولانا عبد السلام صاحب ندوی مرحوم

مولانا عبد السلام صاحب ندوی مرحوم نے عرصہ ہوا قدیم وجدید شعراء اور انکی شاعری پر ایک مبسوط تبصرہ لکھا تھا، جس میں دونوں کے ادبی خدمات اور محاسن و معائب دکھائے تھے، اگر وہ ابتک شائع نہ ہو سکا تھا اور ذہن سے بالکل فراموش ہو چکا تھا، اتفاق سے ان کے مسودات میں یہ مضمون بھی مل گیا، یہ مضمون ادبی و تنقیدی حیثیت سے بھی بلند پایہ اور مولانا مرحوم کی ادبی ژرف نگاہی اور شاعرانہ نکتہ سنجی کا نمونہ ہے، اور اس کی حیثیت اب ادبی تبرک کی بھی ہو گئی ہے، اس لیے اس کو شائع کیا جاتا ہے، یقین ہے کہ اصحاب ذوق اس کو شوق اور دلچسپی سے پڑھیں گے،

"م"

اردو شاعری میں اگرچہ ولی دکنی کے زمانے سے متاخرین شعرائے اردو کے زمانے تک مختلف قسم کے تغیرات پیدا ہوتے رہے، لیکن اصناف شاعری میں کوئی تغیر نہیں پیدا ہوا، اور قصیدہ، مرثیہ، مثنوی اور غزل کے سوا شاعری کی کوئی جدید صنف نہیں پیدا ہوئی، شاعری کی ترقی اور وسعت کا سب سے بڑا میدان مشاعرے تھے، لیکن ان مشاعروں کا موضوع غزل کے سوا اور کچھ نہ تھا، جو بالکل ہوس پرستانہ تفریح و نشاط کا ذریعہ تھے، اس بنا پر موضوع شاعری کے بدلنے کے لیے سب سے بڑی

ضرورت یہ تھی کہ مشاعروں کی نوعیت میں تبدیلی کی جائے، اور یہ تبدیلی سب سے پہلے ۱۸۷۴ء میں کرنل ہالرائڈ نے جو پنجاب کے ڈائرکٹر سررشتہ تعلیم تھے، لاہور میں پیدا کی اور وہاں ایک نئے قسم کے مشاعرے کی بنیاد ڈالی جس میں بجائے مصرع طرح کے مختلف مضامین کے عنوانات دیے جاتے تھے، تاکہ عاشقانہ خیالات کے بجائے مناظر قدرت اور دوسرے شریفانہ جذبات پر نظمیں لکھی جائیں، چنانچہ اس قسم کے مشاعرے کے لیے سب سے پہلے مولانا خواجہ الطاف حسین حالی اور مولوی محمد حسین آزاد نے جن کا تعلق اس وقت سررشتہ تعلیم سے تھا، بطور نمونہ کے چند چھوٹی چھوٹی مثنویاں لکھیں، جن میں بعض اخلاقی مضامین اور بعض مناظر قدرت سے تعلق رکھتی تھیں، یہ پہلا دن تھا کہ جدید اردو شاعری کی داغ بیل پڑی اور اس کے بعد اس میں موضوع شاعری کے لحاظ سے جو ترقی اور وسعت پیدا ہوئی اس کی تقسیم حسب ذیل عنوانات میں کی جاسکتی ہے،

وطنی شاعری | اس صنف شاعری کی بنیاد سب سے پہلے مولانا حالی نے ۱۸۷۴ء میں پنجاب کے مشاعرے میں ڈالی، اور اس میں ایک مثنوی "حب الوطن" کے نام سے لکھکر پڑھی، ان کے شریک کار مولوی محمد حسین آزاد نے بھی وطن پر ایک نظم لکھی جس کا پہلا شعر یہ ہے

حب الوطن ز ملک سلیماں نکوتر است — خار وطن ز سنبل و ریحاں نکوتر است

اس کے بعد چکبست نے ۱۹۰۵ء میں ہندوستان کی قدیم عظمت پر ایک نہایت موثر نظم لکھی، پھر سیاسی ہنگامہ آرائیاں شروع ہوئیں تو چکبست نے ۱۹۱۷ء میں ایک اور وطنی نظم لکھی جس کے ایک بند کا ایک شعر یہ ہے،

وطن پرست شہیدوں کی خاک لائینگے — ہم اپنی آنکھ کا سرمہ اُسے بنائینگے

ڈاکٹر اقبال مرحوم نے بھی وطنی ترانے کو نہایت جوش کے ساتھ گایا،

تاتاریوں نے جس کو اپنا وطن بنایا — جس نے حجازیوں سے دشت عرب چھڑایا

میرا وطن وہی ہے میرا وطن وہی ہے

ان کی ایک اور مؤثر نظم وطن پر اور ہے جس کا پہلا مصرع یہ ہے،

سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا

سرور جہان آبادی نے بھی اس نغمہ کو نہایت موثر لہجے میں گایا،

حبِ وطن کے پودے اس میں نئے لگائیں پھولوں کا کنج دلکش بھارت میں اک بنا ہے

سیاسی شاعری اس دور میں غالباً سب سے پہلے مولانا حالی نے انگریزی سیاست کے حیل و دسائس کو نمایاں کیا، اور اس زمانہ کے انگریز مدبرین سیاست کی تقریروں پر ایک نظم لکھی جس میں ان کے خدا عانہ طرزِ بیان کی قلعی کھولی،

اے بزم سفیرانِ دول کے سخن آرا ہر خرد و کلاں تیری فصاحت پہ فدا ہو

یہ سچ ہو کہ جادو ہے بیاں میں ترے لیکن کچھ سحر بیانی کا ترے ڈھنگ جدا ہو

اسی طرح انھوں نے سیاسی مسائل پر متعدد نظمیں لکھیں، تاہم ابتدا میں یہ سیاسی آواز بالکل دبی دبی رہی، لیکن منسوخی تقسیم بنگال کے بعد مسلمانوں کی قدیم سیاسی پالیسی میں جو انقلاب رونما ہوا اس نے سیاسی شاعری کے قالب میں تازہ روح پھونک دی اور سب سے پہلے مولانا شبلی نے نہایت پُرجوش سیاسی نظمیں لکھیں، سید اکبر حسین صاحب جج نے بھی اپنے مخصوص ظریفانہ انداز میں اس دور کے بہت سے سیاسی مسائل پر اشعار لکھے،

نظموں کے علاوہ غزل پر بھی ان سیاسی خیالات کا اثر پڑا، اور مولانا محمد علی جوہر اور مولانا حسرت موہانی نے اپنی غزلوں میں بھی بہت سے سیاسی خیالات ظاہر کیے،

قومی شاعری اس دور میں غالباً سب سے پہلے مولانا حالی نے سر سید کی تحریک سے اپنے مشہور آفاق مسدس کے ذریعہ سے قومی شاعری کا آغاز کیا، اور اردو زبان میں قومی شاعری کا ایک ایسا عمدہ نمونہ قائم ہوا، جس کی نظیر عربی اور فارسی میں بھی نہیں ملتی، مولانا شبلی، مولانا نذیر احمد اور مولوی اسمٰعیل میرٹھی نے

بھی نہایت عمدہ قومی نظمیں، قصائد اور مسدس وغیرہ کی شکلوں میں لکھیں، قصائد اور مسدس کے علاوہ مولانا شبلی نے اس موضوع پر ایک مستقل مثنوی "صبح امید" کے نام سے بھی لکھی اور مولانا نذیر احمد نے بھی اس موضوع پر متعدد مثنویاں لکھیں، ان سب کے بعد ڈاکٹر اقبال نے شکوہ اور جواب شکوہ لکھا جو ہمہ تن سوز و گداز اور الحاح و زاری تھا،

یہ تمام نظمیں اردو زبان کا سرمایہ ناز ہیں اور ان پر اردو شاعری جس قدر فخر کرے کم ہے،

تاریخی شاعری اس دور میں قومی شاعری کے سلسلے میں بہت سی تاریخی نظمیں بھی لکھی گئیں، تاکہ ان کے ذریعہ سے قوم کے ترقی و تنزل کا نقشہ کھینچا جائے، یا قوم کے دوسرے اخلاقی اور سیاسی جذبات کو ابھارا جائے، چنانچہ مولانا اسمٰعیل میرٹھی نے قلعۂ اکبر آباد پر ایک بے انتہا پرجوش، عبرت انگیز اور موثر نظم لکھی، ہندو شعراء نے بھی اپنی قدیم تاریخ کے بعض مشہور واقعات کو موثر انداز میں نظم کیا، مثلاً رام چندر جی کے بن باس ہوتے وقت سیتا جی نے ساتھ چلنے کے لیے جس طرح منت و زاری کی، اس پر سرور جہان آبادی نے ایک نہایت موثر نظم لکھی، پنڈت برج نرائن چکبست نے مرثیہ کے انداز میں رامائن کا ایک سین دکھایا، اور ان تمام جذبات کو نمایاں کیا، جو اس وقت پیش آئے ہیں جب رام چندر جی ماں سے رخصت ہوئے ہیں،

متفرق نظموں کے علاوہ ایک مستقل مثنوی تاریخ ہند کے نام سے لکھی گئی، جس میں ہندوستان کے تمام صوبوں کی تاریخ نظم کی گئی ہے، لیکن ہم نے بعض کتب خانوں کی فہرست میں صرف اس کا نام پڑھا ہے، آنکھ سے دیکھا نہیں ہے، اس لیے اس کے انداز بیان کے متعلق کوئی رائے نہیں دے سکتے، شاہنامۂ اسلام بھی اسی سلسلے کی کڑی ہے،

اخلاقی شاعری اگرچہ دور قدیم کی شاعری میں بھی اخلاقی شاعری کا عنصر موجود تھا، لیکن اس دور میں جو اخلاقی انقلاب پیدا ہوا اس نے اخلاقی شاعری میں بھی انقلاب پیدا کیا، مثلاً پہلے زہد، توکل، قناعت، استغنا اور بے نیازی وغیرہ کے مضامین جو تصوف کی پیداوار تھے، شاعرانہ

اندازمیں بیان کیے جاتے تھے، لیکن اس دور میں قومی اور سیاسی ترقی کے لیے جد وجہد، محنت ومشقت، صبرو استقلال، اتفاق واتحاد اور عزم وہمت کی ضرورت پیش آئی تو مولانا محمد حسین آزاد، مولوی اسمٰعیل میرٹھی اور مولانا حالی نے ان عنوانات پر بکثرت نظمیں لکھیں، لیکن ان میں ہر بزرگ کا انداز الگ ہے۔

مولانا محمد حسین آزاد کا انداز یہ ہے کہ وہ انگریزی نظموں کو پیش نظر رکھکر ان کے مطالب کو اردو زبان کے قالب میں ڈھال دیتے ہیں، مثلاً انھوں نے ایک عنوان قائم کیا ہے کہ "اولوالعزمی کے لیے کوئی چیز سد راہ نہیں"۔ اور اس پر ایک انگریزی نظم کے انداز پر ایک نظم لکھی ہے، مولوی اسمٰعیل میرٹھی نے قدیم ناصحانہ رنگ اختیار کیا ہے، اور بعض جگہ قصص وحکایات اور بعض جگہ تمثیلات کے پردے میں اخلاقی باتیں بیان کی ہیں، مولانا حالی کی روش اگرچہ بالکل سادہ ہے، تاہم اس میں بھی مخفی طور پر شاعرانہ روح موجود ہے، لیکن آخر میں جب مسلمانوں میں سیاسی بیداری پیدا ہوئی تو اس دور کی اخلاقی شاعری میں بھی ایک تازہ انقلاب پیدا ہوا، اور مولانا شبلی مرحوم نے ان محاسن اخلاق کے متعلق جو سیاست سے تعلق رکھتے ہیں بعض موثر تاریخی واقعات کو نظم کیا، مثلاً مساوات، آزادی، حق گوئی اور عدل وانصاف کے متعلق تاریخ اسلام کے مؤثر واقعات نظم کیے،

ظریفانہ شاعری | قدیم اردو شاعری میں ظرافت کا جو عنصر موجود تھا، وہ اردو شاعری کے دامن کا نہایت بدنما داغ تھا، ہجو، بدگوئی، تمسخر، استہزا، فحاشی اور بدزبانی کا نام ظرافت رکھ لیا گیا تھا، اور سودا، انشا، جعفر زٹلی، چرکین اور جان صاحب نے اس کیچڑ کو خوب اچھالا تھا، لیکن دور جدید میں میر اکبر حسین الہ آبادی نے اس مبتذل صنف کو نہایت لطیف اور کار آمد چیز بنا دیا، اور مغربی تمدن، مغربی تعلیم، مغربی معاشرت اور سیاست کی مخالفت میں نہایت لطیف ظریفانہ انداز میں اپنے خیالات ظاہر کیے، اس بنا پر انھوں نے اس قسم کے جس قدر اشعار کہے ہیں وہ ظرافت کے ساتھ تمدن وتہذیب، اخلاق ومعاشرت، تدبیر وسیاست، غرض قومی زندگی کے تمام ضروری اجزا سے

نہایت گہرا تعلق رکھتے ہیں، اور اس حیثیت سے عربی اور فارسی شاعری میں بھی اس کی کوئی نظیر نہیں ملتی، آخر میں مولانا شبلی مرحوم نے بھی بعض مذہبی، سیاسی اور تعلیمی خیالات کو نہایت لطیف، ظریفانہ انداز میں ظاہر کیا، لیکن بایں ہمہ میر اکبر حسین کے ظریفانہ کلام میں جو اختصار، جو بیساختگی، جو لطافت اور جو جدت پائی جاتی ہے، اس کے لحاظ سے وہی اس صنف کے موجد بھی ہیں اور خاتم بھی، مولانا شبلی کے کلام میں بھی اگرچہ نہایت متانت آمیز ظرافت موجود ہے، تاہم اس کا اثر متعدد اشعار کے بعد ظاہر ہوتا ہے، لیکن میر اکبر حسین کے ظریفانہ اشعار کا پہلا ہی مصرع پڑھکر انسان متبسم ہونے لگتا ہے، ان سب کے بعد لکھنؤ میں ظریف لکھنوی نے ظریفانہ شاعری میں کسی قدر شہرت حاصل کی، لیکن انکی ظرافت مضحکہ کی حد تک پہنچ جاتی ہے، مولانا ظفر علی خاں کی ظرافت اکثر نئے نئے قافیوں کی بدولت پیدا ہوتی ہے، لیکن جہاں کہیں وہ پوری تکچوری پر اتر آتے ہیں، مذاق سلیم پر بار ہو جاتے ہیں،

محاکاتی شاعری | محاکات کے معنی کسی چیز کی نقل یا چربہ اتارنے کے ہیں، لیکن شاعرانہ اصطلاح میں اس کا تعلق اس صنف کلام سے ہے جس سے مناظر قدرت یا اور کسی چیز کا نقشہ کھینچا جاتا ہے، اگرچہ یہ صنف دور جدید کے ساتھ مخصوص نہیں ہے، بلکہ قدما کے کلام میں بھی اس کے بہترین نمونے پائے جاتے ہیں، مثلاً نظیر اکبر آبادی نے مناظر قدرت پر متعدد نظمیں لکھی ہیں، میر انیس اور مرزا دبیر نے مراثی میں صبح وغیرہ کا دلکش سماں دکھایا ہے، اور قصائد کی تشبیبوں اور مثنویوں میں بھی متعدد مواقع پر بہار، خزاں، پہاڑ، دریا اور صبح وشام کے بہت مناظر دکھائے گئے ہیں، لیکن اس صنف نے اس دور میں ایک مستقل حیثیت اختیار کر لی، اور سب سے پہلے انجمن پنجاب کے مشاعرے میں مولانا حالی نے اس کا سنگ بنیاد رکھا اور اس مشاعرے کے لیے ایک مثنوی برکھارت کے نام سے لکھی، جو ان کے مجموعۂ نظم میں شامل ہے، اس کے بعد دور جدید کے متعدد شعراء نے اس صنف میں طبع آزمائیاں کیں، اور اس موضوع پر نظموں کا ایک ایسا ذخیرہ تیار ہو گیا، جو دور قدیم کی محاکاتی

شاعری سے مختلف حیثیتوں سے ممتاز تھا یعنی

(۱) دورِ جدید کے شعراء نے مناظرِ قدرت میں بہت زیادہ تنوع پیدا کیا، اور ہر قسم کے مناظر دکھائے، لیکن قدماء کا دائرہ اس سے بہت زیادہ محدود تھا۔

(۲) ان شعراء نے قدماء کی طرح صرف بہار اور خزاں کے فرضی مناظر نہیں دکھائے جو ہندوستان سے زیادہ ایران کے ساتھ تعلق رکھتے ہیں، بلکہ ملکی مناظر مثلاً سیر کشمیر، سیر ڈیرہ دون، دھان کے کھیت، گنگا جی، شیلانگ اور کلکتہ وغیرہ کے مناظر بھی دکھائے، جن سے اردو شاعری میں ملکی خصوصیات کا عنصر شامل ہوا،

(۳) اسی سلسلے میں بعض تاریخی مناظر بھی آگئے، مثلاً حسرت نے مقبرۂ نور جہاں پر ایک نظم لکھی، مولوی انعام الحق نے دہلی کے کھنڈر کا منظر دکھایا، اور مولوی اسمٰعیل صاحب میرٹھی نے قلعۂ اکبر آباد کا عبرت انگیز نقشہ کھینچا،

(۴) مناظرِ قدرت کے دکھانے کا سب سے بڑا کمال یہ ہے کہ اس قسم کے مخصوص و مترنم الفاظ استعمال کیے جائیں، جن سے خود بخود کسی منظر کی تصویر کھنچ جائے، مثلاً ساودی نے ایک نظم میں سیلاب کی روانی کا سماں دکھایا، تو ایسے الفاظ استعمال کیے جن سے خود بخود سیلاب کی تدریجی رفتار کا نقشہ کھنچ گیا، موجودہ دور میں سید اکبر حسین صاحب الٰہ آبادی نے اسی انداز کے الفاظ میں اس نظم کا ترجمہ کیا جس سے اردو زبان کے الفاظ کی شاعرانہ اور انشاپردازانہ قوت کا اندازہ ہو سکتا ہے،

مناظرِ قدرت کے علاوہ محاکاتی شاعری کی ایک اور قسم ہے، جس کو اصطلاح میں وصف نگاری کہتے ہیں، اور یہ صنعت مناظرِ قدرت سے زیادہ وسیع اور عام ہے، مناظرِ قدرت میں صرف وہ چیزیں داخل ہیں جو انسان کے دل میں مسرت، جوش، انبساط، خوف، عبرت یا اور کسی قسم کا جذبہ پیدا کرتی ہیں، مثلاً چاندنی، برسات، بہار، پہاڑ، میدان اور قبرستان وغیرہ، لیکن وصف نگاری کو جذبات

سے کوئی لازمی تعلق نہیں ہے، بلکہ اس کے ذریعہ سے صرف موجوداتِ عالم کی حقیقت بتائی جاتی ہے، یا انکے مخصوص اوصاف نمایاں کیے جاتے ہیں، اور اس سلسلے میں مصنوعی چیزیں مثلاً جلوس، دربار اور برات وغیرہ کے سمے بھی اس میں شامل ہو جاتے ہیں، اگرچہ قدیم اردو شاعری میں بھی اس کا کافی ذخیرہ موجود ہے؛ چنانچہ مثنویوں میں دربار کی رونق، شادی کی دھوم دھام، اور جلوس وغیرہ کی جو کیفیت دکھائی گئی ہے، یا مرثیوں میں تلوار اور گھوڑوں کی جو تعریف کی گئی ہے، وہ سب اسی وصف نگاری میں داخل ہے؛ لیکن قدماء کے دور تک یہ ایک ضمنی چیز تھی، دورِ جدید کا کارنامہ یہ ہے کہ اس نے اس کو ایک مستقل صنعت بنا دیا، اور بہت سی چیزوں مثلاً کوا، ابابیل، قمری، کبوتر، مور، بلبل، تیتری اور تتلی وغیرہ پر نظمیں لکھی گئیں اور اس تنوع اور وسعت کے ساتھ دورِ جدید کے شعراء نے مناظرِ قدرت کی طرح وصف نگاری میں بھی بہ نسبت شعرائے قدیم کے نیچر کا رنگ زیادہ نمایاں کیا، مثلاً آموں کی تعریف میں غالب نے جو نظم لکھی ہے، اس کا موازنہ اگر بے نظیر کی اس نظم سے کیا جائے جو آموں کی تعریف میں لکھی گئی ہے، تو یہ فرق علانیہ ظاہر ہوگا۔

متفرق نظمیں | ان کے علاوہ اور بھی بہت سی متفرق نظمیں لکھی گئیں جن میں انگریزی شاعری کا پرتو نہایت واضح طور پر نمایاں تھا، مثلاً ایک شخص نے پریڈ ائز لاسٹ کو نظم کیا اور انگریزی کی بہت سی چھوٹی چھوٹی نظموں کا ترجمہ نظم میں کیا گیا، چنانچہ شیخ غلام محی الدین صاحب ایم، اے نے اس قسم کی نظموں کا ایک مستقل مجموعہ "دو آتشہ" کے نام سے شائع کیا ہے، جس میں اردو شعراء کی بہت سی ترجمہ کردہ نظمیں انگریزی کی اصل نظموں کے ساتھ جمع کی ہیں۔

اس قسم کی نظموں کے ترجمہ سے ایک طرف تو اردو شاعری نئے نئے عنوانات اور نئے نئے خیالات سے آشنا ہوئی، دوسری طرف اردو زبان میں نئی نئی تشبیہات و استعارات کا اضافہ ہوا، مثلاً

تاڑ سے مستول پر تنہا کھڑا ہے ناخدا　　　تند موجوں کے ہے جھولے میں جھکولے لے رہا

زور پر آیا ہے طوفاں چل رہی ہیں آندھیاں ابر تک لہروں کو جو لے جا رہی ہیں موکشاں

یوں فلک پر ماند اور دھیما نظر آتا تھا چاند طفل مکتب کا پتنگ اڑتا ہو جیسے اوج پر

سیر کو ان کا لب جو اس جگہ آنا جہاں آب دجلہ نے بچھایا بستر آرام تھا

آبنوسی زلفیں موتی سے رخ پر نور پر

زلف تھی پتلی کمر کے گرد پیٹی کی طرح

بعض شعراء مثلاً مولوی محمد حسین آزاد اور مولوی اسمٰعیل میرٹھی وغیرہ نے انگریزی شاعری کی تقلید میں بعض غیر مقفیٰ نظمیں بھی لکھیں، بعض شعراء نے انگریزی نظموں کی بعض بحروں کو بھی اردو میں داخل کرنا چاہا، لیکن اس قسم کی نظمیں اور اس قسم کی بحریں اپنی نوعیت کے لحاظ سے اردو زبان سے میل نہیں کھاتی تھیں، اس لیے اردو میں ان کو قبول عام حاصل نہیں ہوا،

مسٹر عظمت اللہ نے یہ جدت کی کہ ہندی دوہروں کی پیروی اردو نظم میں شروع کر دی، ان نظموں کے الفاظ اور مضامین وغیرہ بھی ہندی ہی ہوتے ہیں، جن کو اس زمانے میں بہت پسند کیا جاتا ہے،

قدیم اصناف شاعری کا تنزل دور جدید نے اگرچہ جیسا کہ ان تصریحات سے معلوم ہوا ہوگا، شاعری کے میدان میں بہت زیادہ وسعت پیدا کی، اور شاعری کی متعدد صنفیں ایسی پیدا کیں جن سے قدیم دور کی شاعری بالکل ناآشنا تھی، تاہم اس دور میں شاعری کی بہت سی قدیم اصناف کو بالکل زوال بھی آگیا اور شعرائے دور جدید نے ان میں کسی قسم کی اصلاح اور ترقی نہیں کی، مثلاً قدیم دور میں اگرچہ قصیدہ اخلاقی حیثیت سے شاعری کی کوئی اچھی صنف نہ تھی، اور صلہ و انعام حاصل کرنے کے لیے اس کو ایرانی اور ہندوستانی شعراء نے نہایت مبتذل بنا دیا تھا، تاہم شاعرانہ قوت کے اظہار کا وہ بہت بڑا ذریعہ تھی، لیکن اس صنف کی ترقی و اصلاح کے متعلق شعرائے دور جدید کا کوئی کارنامہ نہیں ہے، البتہ عزیز لکھنوی اس سے مستثنیٰ ہیں، یہ سچ ہے کہ قدیم دور میں زیادہ تر امراء و سلاطین کی مدح و ستائش میں

قصائد کہے جاتے تھے، اور چونکہ اب اس قسم کی سلطنتیں قائم نہیں رہیں، اس لیے قدرتی طور پر قصائد کی وسعت و ترقی کے لیے کوئی میدان باقی نہیں رہا، لیکن ہندوستان میں اب بھی متعدد ریاستیں قائم ہیں، جہاں ترقی یافتہ اصلاحی قصائد کی قدر دانی کی جا سکتی تھی، اس کے ساتھ قدیم زمانہ کی شاعری میں بھی قصائد صرف امراء و سلاطین کی مدح و ستائش تک محدود نہیں ہیں، بلکہ بہت سے شعراء نے صوفیانہ اور اخلاقی مضامین پر بھی قصائد لکھے ہیں، خود قوم کی مدح و ستائش میں قصائد لکھے جا سکتے ہیں، اور زمانۂ جاہلیت میں اہل عرب کے قصائد زیادہ تر قومی ہی مفاخر پر مشتمل ہوتے تھے، اس لیے شعرائے دور جدید اگر قصائد کی قدیم روش میں اصلاح کرنا چاہتے تو ان قصائد کو پیش نظر رکھکر وہ قصائد کی قدیم روش میں بہت کچھ اصلاح و تغیر کر سکتے تھے، لیکن انھوں نے قصائد کو سرے سے ہاتھ ہی نہیں لگایا، اس لیے قدیم شاعری کی ایک نہایت بڑی صنف ان کے ہاتھ سے نکل گئی،

مولانا حالی جو جدید شاعری کے موجد اور قدیم شاعری کے مجدد ہیں، اگرچہ قدیم دور کے قصائد کی حالت کو ناگفتہ بہ کہتے ہیں، تاہم ان کے نزدیک بھی قصیدہ کوئی بیکار چیز نہیں ہے بلکہ وہ اس کو شاعری کی ایک نہایت ضروری صنف قرار دیتے ہیں، چنانچہ مقدمۂ شعر و شاعری میں لکھتے ہیں کہ

قصیدہ بھی اگر اس کے معنی مطلق مدح و ذم کے لیے جائیں اور اس کی بنیاد محض تقلیدی مضامین پر نہیں، بلکہ شاعر کے سچے جوش اور ولولے پر ہو تو شعر کی ایک نہایت ضروری صنف ہے جس کے بغیر شاعر درجۂ کمال کو نہیں پہنچ سکتا، اور اپنے بہت سے اہم اور ضروری فرائض سے سبکدوش نہیں ہو سکتا،

البتہ ان کے نزدیک قصائد میں اصلاح و ترقی کی ضرورت ہے، اور اس اصلاح و ترقی کی صورت صرف یہ ہے کہ مدح و ذم کا طریقہ یورپ کی موجودہ شاعری سے اخذ کیا جائے اور آئندہ قصائد کی بنیاد اسی طریقہ پر رکھی جائے کیونکہ اولاً تو اردو میں فارسی اور عربی شاعری کے مقابلے میں قصائد

یونہی کم لکھے گئے، دوسرے اس زمانے میں جس قسم کے قصائد کی ضرورت ہے یا آیندہ ہونے والی ہے یا ہونی چاہیے، اس کا کوئی نمونہ ہماری زبان میں موجود نہیں ہے، البتہ عربی شاعری میں کسی قدر زیادہ اور فارسی شاعری میں اس سے کم ایسے نمونے ضرور مل سکتے ہیں، لیکن دور جدید کے شعرا، پر ان اصلاحی خیالات کا کوئی اثر نہیں پڑا، اور انھوں نے قصائد میں اپنی جدت طرازی کا کوئی کمال نہیں دکھایا،

مرثیہ بھی قصیدہ ہی کی ایک خاص قسم ہے، البتہ دونوں میں یہ فرق ہے کہ قصائد میں صرف زندہ لوگوں کی مدح وستایش کی جاتی ہے، اور مردوں کی تعریف کو جس میں تاسف اور افسوس بھی شامل ہو مرثیہ کہتے ہیں، لیکن اردو شاعری میں مرثیہ کا اطلاق زیادہ تر شہدائے کربلا اور بالخصوص جناب سید الشہداء کے مرثیہ پر ہوتا ہے، اس قسم کے مرثیوں کی ابتداء اول اول بالکل اصول فطرت کے مطابق ہوئی یعنی ان میں مرثیت اور بین کے سوا اور کوئی مضمون نہیں ہوتا تھا، لیکن متاخرین نے اس میں بہت کچھ جدتیں پیدا کیں اور اس کے مضامین میں بہت کچھ اضافہ کیا، اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ جس شاعری کی بنیاد محض بین اور مرثیت پر تھی، اس میں مرثیت کے علاوہ مدح وذم، فخر ومباہات اور رزم وبزم وغیرہ کے بہت سے مضامین شامل ہو گئے، اگرچہ براہ راست ان مضامین کا تعلق مرثیہ سے نہ تھا، تاہم اس میں کوئی شبہ نہیں کہ ان مضامین کے اضافہ سے اردو شاعری میں بے انتہا وسعت پیدا ہو گئی اور اردو شاعری میں نہایت کثرت سے بیان کے نئے نئے اسلوب پیدا ہو گئے، سب سے پہلے میر ضمیر نے اس طرز کی ابتدا کی اور میر انیس اور مرزا دبیر نے اس کو اوج کمال تک پہنچا دیا، قدیم زمانے میں تو شعراء میں یہ مقولہ مشہور تھا کہ "بگڑا شاعر مرثیہ گو اور بگڑا گویا مرثیہ خوان" لیکن میر انیس نے اس مقولہ کو بالکل باطل کر دیا، اور دور جدید میں مولانا شبلی مرحوم جیسے محقق فن نے اردو شاعری کی وسعت وترقی دکھانے کے لیے میر انیس ہی کے کلام کو منتخب کیا اور اس پر موازنۂ انیس و دبیر کے نام سے ایک مستقل کتاب لکھی جس کے دیباچہ میں لکھتے ہیں کہ

فلسفہ اور شاعری برابر درجہ کی چیزیں ہیں لیکن قوم کی بدمذاقی سے جس قسم کی شاعری نے ملک میں

قبول عام حاصل کر لیا ہے، اس نے لوگوں کو یقین دلا دیا ہے کہ اردو شاعری میں زلف وخال وخط یا جھوٹی خوشامد اور مداحی کے سوا اور کچھ نہیں ہے، میر تقی کی غزلیت، درد کا تصوف، غالب کا فلسفہ شاعری کی جان ہیں، لیکن ان بیش بہا خزانوں میں سے بھی عام لوگوں کی نگاہ صرف خون ریزی پر پڑتی ہے، میر انیس کا کلام شاعری کے تمام اصناف کا بہتر سے بہتر نمونہ ہے، لیکن ان کی قدر دانی کا طغرائے امتیاز صرف اس قدر ہے کہ کلام فصیح ہوتا ہے اور بین اچھا لکھتے ہیں، اس بنا پر مدت سے میرا ارادہ تھا کہ کسی ممتاز شاعر کے کلام پر تقریظ وتنقید لکھی جائے جس سے اندازہ ہو سکے کہ اردو شاعری باوجود کم مائگی زبان کیا پایہ رکھتی ہے؟ اس غرض کے لیے میر انیس سے زیادہ کوئی شخص انتخاب کے لیے موزوں نہیں ہو سکتا تھا، کیونکہ ان کے کلام میں شاعری کے جس قدر اصناف پائے جاتے ہیں اور کسی کے کلام میں نہیں پائے جاتے،

اس بنا پر اگر شعرائے دور جدید نے اس صنف کو اپنے شاعرانہ کمال کے اظہار کا ذریعہ بنایا ہوتا، تو ان کو شاعری کی وسعت اور ترقی کے لیے ایک وسیع میدان ہاتھ آ جاتا، اور زلف وخال وخط کو چھوڑ کر ان کی جدت طرازی کے لیے شاعری کی اور بہت سی صنفیں مثلاً جذبات انسانی، مناظر قدرت، سین، واقعہ نگاری اور رزمیہ شاعری وغیرہ مل جائیں، لیکن افسوس ہے کہ شعرائے دور جدید نے اس صنف کو بالکل ہاتھ نہیں لگایا اور اس لکیر کو اب تک وہی لوگ پیٹتے جاتے ہیں جو پرانی لکیر کے فقیر ہیں،

مثنوی مولانا حالی کی رائے میں شاعری کی سب سے زیادہ کارآمد صنف ہے، کیونکہ اردو اور فارسی میں شاعری کی جتنی صنفیں متداول ہیں ان میں مسلسل مضامین کے بیان کرنے کے لیے مثنوی سے بہتر کوئی صنف نہیں ہے، اسی صنف کی وجہ سے فارسی شاعری کو عرب کی شاعری پر ترجیح دی جا سکتی ہے، عرب کی شاعری میں مثنوی کے رواج نہ ہونے یا نہ ہو سکنے کی وجہ سے تاریخ یا قصہ یا اخلاق یا تصوف میں بظاہر ایک کتاب بھی ایسی نہیں لکھی جا سکی جیسی فارسی میں سیکڑوں بلکہ ہزاروں لکھی گئی ہیں،

دورِ جدید میں اردو شاعری کا پایہ بلند کرنے کے لیے اس صنف کی ترقی و اصلاح کی سخت ضرورت تھی، کیونکہ اردو میں چھوٹی چھوٹی عاشقانہ مثنویوں کے سوا اخلاق یا تاریخ وغیرہ میں بظاہر آج تک کوئی چھوٹی یا بڑی مثنوی کسی مسلّم الثبوت استاد نے نہیں لکھی، عاشقانہ مثنویوں کا حال بھی اس زمانہ کے مقتضا اور مذاق سے بمراحل دور ہے، جو قصے ان مثنویوں میں بیان کیے گئے ہیں، ان میں قطع نظر اس کے کہ ناممکن اور خرق العادۃ باتیں اور حد سے زیادہ مبالغہ اور غلو بھرا ہوا ہے، اکثر مثنویوں میں شاعری کے فرائض بھی پورے پورے ادا نہیں ہوئے، اس بنا پر دورِ جدید کے شعراء کا یہ فرض تھا کہ وہ اردو شاعری کی اس کمی کو پورا کرتے اور اردو شاعری میں اخلاق، تصوف یا دوسرے مضامین پر ایسی عمدہ مثنویاں لکھتے جن سے شاعری کے تمام فرائض پورے پورے ادا ہو جاتے لیکن افسوس ہے کہ شعرائے دورِ جدید نے اس ضروری اور مفید صنف کو سرے سے ہاتھ نہیں لگایا، ابتداءً میں مولانا حالی نے جدید طرز پر چند چھوٹی چھوٹی مثنویاں بے شبہہ لکھی تھیں، لیکن ان کے بعد کے شعراء نے ان کی بالکل تقلید نہیں کی، ان کے علاوہ اردو شاعری کی اور دوسری صنفیں، مثلاً مسدس، ترجیع بند اور ترکیب بند وغیرہ سے بھی شعرائے دورِ جدید کا کلام خالی ہے، مولانا حالی کا مسدس بے شبہہ اردو شاعری کے لیے ایک قابلِ فخر چیز ہے، لیکن ان ہی پر اس کا خاتمہ ہو گیا، اور ان کے بعد کسی اور نے اس میدان میں قدم رکھنے کی جرأت نہیں کی،

غزل | اب قدیم اصنافِ سخن میں سے صرف ایک آسان صنف غزل باقی رہ جاتی ہے اور شعرائے دورِ جدید نے صرف اسی صنف کو اپنا معیارِ کمال قرار دیا ہے، اور موجودہ دور میں اس صنفِ سخن میں طبع آزمائی کرنے والے شعراء اس کثرت سے پیدا ہو گئے ہیں جن کی تحدید کوئی آسان کام نہیں، تقریباً ہر اردو اخبار کی ابتدا ان ہی شعراء کے کلام سے ہوتی ہے، اور تقریباً ہر اردو رسالے میں تین چار صفحوں کے بعد ان کی کوئی نہ کوئی غزل ضرور نظر سے گذر جاتی ہے، آجکل گھر گھر جو مشاعرے ہوتے رہتے ہیں ان کی رونق زیادہ تر اسی قسم کے

شعراء کے کلام سے ہوتی ہے، ان میں کچھ لوگ ایسے بھی ہیں کہ جب ان کے کلام کا اس قدر ذخیرہ جمع ہو جاتا ہے جس کو وہ مطبوعہ شکل میں ملک و قوم کے سامنے پیش کر سکیں تو وہ چار جزو میں اس کو چھپوا بھی لیتے ہیں، اور اپنی تصویر، اپنے حالات اور اپنے کلام کے تبصرہ سے اس کی اہمیت اور وقعت کو بہت زیادہ بڑھانا چاہتے ہیں، لیکن موجودہ دور کے غزل گو شعراء میں جگر مراد آبادی، فانی بدایونی، سیماب اکبر آبادی، اصغر گونڈوی اور حسرت موہانی اور عزیز لکھنوی نے زیادہ شہرت حاصل کی ہے، اور ان کے کلام کے جو مجموعے شائع ہوئے ہیں، ان کو اگرچہ صحیح طور پر قدیم اصطلاح کے مطابق دیوان نہیں کہہ سکتے، تاہم دورِ جدید میں غزل گوئی کا جو انداز قائم ہوا ہے اس کا اندازہ ان سے بخوبی ہو سکتا ہے، اس لیے ہم ان ہی شعراء کے کلام کو پیش نظر رکھکر دورِ جدید کی غزل گوئی کے محاسن و معائب پر تبصرہ کرنا چاہتے ہیں۔

جدید دور اصلاح و ترقی کا دور ہے اس لیے اس دور میں مولانا حالی نے قدیم غزلگوئی کی اصلاح و ترقی کی حسب ذیل صورتیں بتائی ہیں۔

(۱) اردو زبان کی قدیم غزلوں میں ہمیشہ عاشقانہ مضامین باندھے جاتے ہیں، جو اکثر مخربِ اخلاق ہوتے ہیں، اس لیے ان کے بجائے اخلاقی اور تمدنی مضامین باندھنے چاہئیں اور مناظرِ قدرت مثلاً کوہ و دشت، صحرا و بیابان، اور برق و باران وغیرہ کا سماں دکھانا چاہیے، جیسا کہ انگریزی شاعری میں ان چیزوں کا سماں دکھایا جاتا ہے، لیکن شعرائے دورِ جدید کی غزلیں اس اصلاحی صورت سے بالکل معرا ہیں، ان کی غزلوں میں کہیں بھی اخلاقی اور تمدنی مضامین نہیں پائے جاتے، مناظرِ قدرت پر اگرچہ دورِ جدید کے شعراء نے بہت سی نظمیں لکھی ہیں، لیکن یہ ایک مستقل صنف کی حیثیت رکھتی ہے، غزلوں میں اس قسم کے مضامین نہیں پائے جاتے، تاہم ہمارے نزدیک یہ موجودہ غزلگوئی کا کوئی عیب نہیں ہے، کیونکہ اگر غزلوں میں اس قسم کے مضامین ادا کیے جائیں تو وہ معیارِ تغزل سے بالکل گر جائیں، کسی عمارت کی اصلاح کے یہ معنی نہیں ہیں کہ پرانی دیواروں کو منہدم کر کے نئے سرے

نئی دیواریں اٹھائی جائیں، بلکہ اس کی اصلاح کی صورت صرف یہ ہے کہ پرانی دیواروں میں شکستگی اور بوسیدگی کے جو آثار پیدا ہو گئے ہیں، ان کو دور کر دیا جائے،

(۲) اردو زبان کی قدیم غزلوں میں عموماً بسیط خیالات ادا کیے جاتے ہیں، یعنی ہر شعر کا مضمون جدا ہوتا ہے، اور اس میں صرف ایک ہی خیال ادا کیا جاتا ہے، اس لیے غزل کو قطعہ بند ہونا چاہیے جس میں اول سے آخر تک مسلسل طور پر کسی خاص کیفیت یا خاص جذبہ کا اظہار کیا جا سکے لیکن شعرائے دور جدید کی غزلوں میں یہ اصلاحی کارنامہ بھی کہیں نظر نہیں آتا، بلکہ اس حیثیت سے شعرائے قدیم میں بہت سے اساتذہ کو ان پر ترجیح حاصل ہے، مثلاً جعفر علی حسرت کا یہ خاص انداز ہے کہ وہ اپنی غزلوں کو قطعات پر ختم کرتے ہیں، قائم کے قطعات ورباعیات کی داد تمام تذکرہ نویسوں نے دی ہے، اور فدوی لاہوری کی شاعری کا سرمایۂ ناز یہی قطعات تھے، سعادت یار خاں رنگین بھی قطعے اور منظوم خطوط کے لکھنے میں مشہور تھے، مرزا الف بیگ فرصت الہ آبادی بھی اس باب میں شہرت رکھتے تھے، اگرچہ اردو زبان کے شعرا میں کوئی شاعر ایسا نہیں گذرا ہے جس نے صرف مسلسل غزلیں یا مسلسل قطعے ہی لکھے ہوں، تاہم قدما نے مسلسل قطعات کا ایک ایسا ذخیرہ فراہم کر دیا ہے کہ اس حیثیت سے اردو شاعری کو بالکل بے مایہ نہیں کہہ سکتے، چنانچہ مولوی عبد الغفور خاں نساخ نے ایک مستقل تذکرہ "قطعۂ منتخب" کے نام سے صرف ان شعرا کے حالات میں لکھا ہے جنھوں نے قطعے لکھے ہیں، اور اس میں ان کے ہر قسم کے اخلاقی، صوفیانہ اور عاشقانہ قطعے جمع کر دیے ہیں، لیکن بایں ہمہ ہمارے نزدیک یہ بھی دور جدید کی غزل گوئی کا کوئی عیب نہیں ہے، مفرد اور بسیط خیالات جو ہر انسان کے دل میں ہر وقت پیدا ہوتے رہتے ہیں، ان کی تعداد ان مسلسل و مربوط خیالات سے بہت زیادہ ہے، جو کبھی کبھی کسی انسان کے دل میں پیدا ہو جاتے ہیں، اس لیے غزل کو صرف مسلسل خیالات اور مسلسل جذبات میں محدود کرنے کے معنی یہ ہیں کہ ہزاروں عمدہ

خیالات اور موثر جذبات کو ان پر قربان کر دیا جائے، غزل کی عام دلآویزی کا سبب صرف یہی ہے کہ وہ ہر شخص کے مفرد اور بسیط خیالات کی ترجمانی نہایت رنگین پیرایۂ بیان میں کرتی ہے،

(۳) اردو اور فارسی زبان کی غزلوں میں قافیے کے ساتھ ردیف کا التزام بھی گویا ایک لازمی چیز ہو گیا ہے، جس سے شاعر کی پابندیاں بڑھ جاتی ہیں، اور اظہار خیال کا میدان تنگ ہو جاتا ہے، اس لیے صرف قافیہ کا التزام کر لینا چاہیے اور ردیف کو بالائے طاق رکھ دینا چاہیے، لیکن شعرائے دور جدید نے اس اصلاح کی طرف کوئی نمایاں قدم نہیں اٹھایا بلکہ ان کی غزلیں بھی قافیہ کے ساتھ ردیف کی زنجیروں میں جکڑی ہوئی نظر آتی ہیں،

(باقی)

ابن الجزری

جناب مولانا عبدالحلیم صاحب چشتی فاضل دیوبند

(۳)

(۲۴) الحصن الحصین :- اس کتاب کا پورا نام الحصن الحصین من کلام سید المرسلین ہے، جس کے معنی سید المرسلین کے کلام سے انتخاب کیا ہوا مضبوط قلعہ ہیں، یہ نام بھی غالباً حدیث ہی سے ماخوذ ہے، ایک حدیث میں وارد ہے:

امرکم ان تذکروا الله فان مثل ذالک	(حضرت یحییٰ علیہ السلام نے بنی اسرائیل سے فرمایا) میں تمھیں یہ
کمثل رجل خرج العدو فی اثرہ سراعا	حکم دیتا ہوں کہ تم اللہ کا ذکر کرو، کیونکہ اس ذاکر کی
حتی اذا اتی علی حصن حصین فاحرز	مثال اس شخص کی سی ہے جسکے پیچھے دشمن دوڑتا ہوا نکلا
نفسہ منهم کذالک العبد لا یحرز نفسه	اور اس نے ایک مضبوط قلعہ پر پہنچکر اپنے آپ کو بچا لیا،
من الشیطان الا بذکر الله تعالیٰ	اسی طرح بندہ اپنے کو بغیر ذکر الٰہی کے شیطان سے نہیں بچا سکتا ہے

محدث محمد الشوکانی تحفۃ الذاکرین میں رقمطراز ہیں،

لعل المصنف رحمه الله اخذ تسمیة	شاید مصنف نے اپنی کتاب الحصن الحصین کا نام
کتابه (الحصن الحصین) الذی هو اصل	جو عدۃ الحصن الحصین کی اصل ہے، حدیث کے اسی
هذا الکتاب من هٰهنا	ٹکڑے سے لیا ہے،

یہ اذکار اور ادعیہ کی نہایت جامع کتاب ہے، ۲۲ ذی الحجہ ۷۹۱ھ میں سنیچر کے دن ظہر کے بعد اس

کی تکمیل سے فراغت ہوئی، اس وقت کسی غنیم نے دمشق کا محاصرہ کر رکھا تھا، خلق خدا بڑی پریشان تھی، آپ نے اس نازک وقت میں اسی کتاب کو پناہ کا وسیلہ بنایا، جیسا کہ خاتمۂ کتاب میں تحریر فرماتے ہیں:

جمیع ابواب دمشق معلقة بل مشیدة	(یہ کتاب اس فتنہ و فساد کے وقت ختم ہوئی) جب دمشق
بالاحجار والخلائق یستغیثون علی	کے تمام دروازے بند اور پتھروں سے مستحکم تھے، مخلوق
الاسوار وفی جهاد عظیم من الحصار	شہر پناہ پر بارگاہ الٰہی میں فریاد کر رہی تھی اور ظالموں
والمیاه مقطوعة والایادی مرفوعة وقد	کے محاصرہ کی وجہ سے بڑی مصیبت میں تھی، یہاں تک کہ پانی تک
احرق ظواهر البلد ونهب اکثره وکل احد	بند کر دیا گیا تھا، لوگوں کے ہاتھ عجز و انکساری کے ساتھ
خائف علی نفسه وماله واهله وجل	بارگاہ رب العزت میں اٹھے ہوئے تھے، شہر کے گرد و نواح
من ذنوبه وسوء اعماله وقد تحصن	میں آگ لگی ہوئی تھی اور اسکا بڑا حصہ لوٹ لیا گیا تھا،
بما یقدر علیه فجعلت هذا الحصن و	ہر شخص اپنی جان و مال اور اہل و عیال کے بارے میں خائف،
توکلت علی الله تعالیٰ وهو حسبی ونعم الوکیل	اپنی بد اعمالی اور گناہوں کی وجہ سے خوف زدہ تھا، ہر ایک
	نے اپنی استطاعت کے مطابق پناہ لے رکھی تھی، بس میں نے

معلوم ہوتا ہے جس ظالم نے محاصرہ کیا تھا، وہ آپ کا جانی دشمن تھا، چنانچہ اس نے مختلف تدبیروں سے آپ کو پکڑ واکر بلوانا چاہا، مگر آپ روپوش ہو گئے، حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو خواب میں دیکھا، اور اسی کتاب کے طفیل اس سے نجات پائی، جیسا کہ آغاز کتاب میں لکھتے ہیں:

لما اکملت ترتیبه وتهذیبه طلبنی	جب میں اس کتاب کی ترتیب اور اصلاح مکمل کر چکا
عدو لا یمکن ان یدافعه الا الله تعالیٰ	تو مجھے ایک ایسے دشمن نے تلاش کیا جسکو اللہ تعالیٰ کے سوا

[1] اس بیان سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ اس زمانہ میں آپ عوام میں اپنی ہر دلعزیزی کے باعث ارباب اقتدار کی نظروں میں کھٹکتے تھے، اسی لیے دشمن آپ کو پکڑنے کی فکر میں تھا۔

فهربت منه مختفیا و تحصنت بهذا الحصن فرأیت سید المرسلین صلی اللہ علیہ وسلم وانا جالس علی یسارہ وکانه صلی اللہ علیہ وسلم یقول ما ترید فقلت له یا رسول اللہ ادع اللہ لی وللمسلمین فرفع رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یدیه الکریمتین وانا انظر الیهما فدعا ثم مسح بهما وجهه الکریم وکان ذلک لیلة الخمیس فهرب العدو لیلة الاحد وفرج اللہ عنی وعن المسلمین ببرکة ما فی هذا الکتاب عنه صلی اللہ علیہ وسلم

کوئی دفع کرنے والا نہ تھا، میں اس سے چھپ کر بھاگ گیا اور اس (مضبوط و مستحکم) قلعہ کو اپنی حفاظت کا ذریعہ بنایا (یعنی وظیفہ کے طور پر اسے پڑھنا شروع کیا) میں نے سید المرسلین صلی اللہ علیہ وسلم کو خواب میں دیکھا کہ میں آپ کے بائیں جانب بیٹھا ہوں اور آپ فرما رہے ہیں تم کیا چاہتے ہو، میں نے عرض کیا یا رسول اللہ! آپ میرے اور تمام مسلمانوں کے لیے دعا فرمائیں، میری درخواست پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے دعا کے لیے دست مبارک اٹھا دیے، میں آپ کے ہاتھوں کی طرف دیکھتا رہا، پھر آپ نے دعا فرمائی اور اپنے روئے مبارک پر ہاتھ پھیرا، جمعرات کو میں نے یہ خواب دیکھا، اتوار کی رات میں دشمن بھاگ گیا، اور ان احادیث نبویہ کی برکت سے جو اس کتاب میں جمع ہیں اللہ تعالیٰ نے میری اور تمام مسلمانوں کی مصیبت دور فرما دی ہے۔

یہ قطعہ بہت مشہور ہے:

ان نابک الامر المهول اذکر اللہ العالمینا

اگر کسی مصیبت کا سامنا ہو تو خدا کو یاد کرو،

واذا بغی باغ علیک فلا ونک الحصن الحصینا

اور جب کوئی باغی تم پر ظلم کرے تو اس مضبوط قلعہ کو جائے پناہ قرار دو،

حاجی خلیفہ کا بیان ہے کہ یہ دشمن امیر تیمور تھا جس نے آپ کو طلب کیا تھا، اور آپ بھاگ کر روپوش ہو گئے تھے، پھر حضورؐ کی دعا کے طفیل آپ کو اور اہل دمشق کو نجات ملی، چنانچہ کشف الظنون میں لکھتے ہیں:-

ولما اکمل ترتیبه طلبه عدو وهو تیمور فهرب منه مختفیا وتحصن بهذا الحصن فرای سید المرسلین صلے اللہ علیہ وسلم جالسا علی یمینه[1]

جب آپ اس کتاب کو مکمل اور مرتب کر چکے تو آپ کے دشمن نے آپ کو بلوایا جو تیمور تھا، آپ اس سے بھاگ کر چھپ گئے، اور اس کتاب الحصن الحصین کو پناہ کا وسیلہ بنایا، اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو خواب میں اپنی داہنی جانب تشریف فرما دیکھا،

مولانا عبد الحیؒ فرنگی محلی کا بھی یہی خیال ہے، چنانچہ موصوف الحصن الحصین کے خاتمہ پر رقمطراز ہیں،

کان تصنیفه الحصن فی وقعة تیمور لنگ وهو المراد بالعدو المذکور فی دیباجته کما یفهم من عجائب المقدور فی اخبار تیمور[2]

آپ کی تالیف الحصن الحصین تیمور لنگ کے فتنہ کے زمانہ کی ہے اور لفظ عدو سے جو مولف کے دیباچہ کتاب میں مذکور ہے، تیمور مراد ہو جیسا کہ عجائب المقدور فی اخبار تیمور سے بھی سمجھا جاتا ہے،

ہمارے خیال میں تیمور کو عدو قرار دینا محل نظر ہے، کیونکہ سنہ ۷۹۱ھ میں تیمور کا دمشق یا اطراف دمشق کا محاصرہ تاریخ سے ثابت نہیں، اس زمانہ میں تیمور فارس کے اطراف میں تھا[3]، ابن عربشاہ نے دمشق کی تباہی کا جو واقعہ عجائب المقدور فی اخبار تیمور میں تاریخ ابن شحنہ سے نقل کیا ہے، اور مذکورہ بالا عبارت میں غالباً اسی کی طرف مولانا عبد الحیؒ کا بھی اشارہ ہے، وہ بعد کا واقعہ ہے، اس لیے جب

[1] اسی عبارت کا ترجمہ نواب صدیق حسن خاں قنوجی نے اتحاف النبلاء ص ۲ پر کیا ہے۔ [2] الحصن الحصین المحشی مطبع یوسفی لکھنؤ سنہ ۱۳۲۰ھ ص ۲۵۱۔ [3] ملاحظہ ہو انسائیکلوپیڈیا آف اسلام (تیمور) اور عجائب المقدور فی اخبار تیمور، از ابن عربشاہ طبع کلکتہ

شخص نے دمشق کا محاصرہ کیا تھا، دراصل وہی عدو (غنیم) کا مصداق ہوسکتا ہے،

حقیقت یہ ہے کہ دمشق ۷۹۱ھ میں سخت خانہ جنگی اور طوائف الملکی کے دور سے گذر رہا تھا، شہر سے باہر الملک الظاہر برقوق اور امیر تمر بغا افضل جو منطاش کے نام سے مشہور ہے، باہم نبرد آزما تھے، منطاش نے دمشق کا محاصرہ کرلیا تھا، اور گردونواح میں لوٹ مار اور قتل و غارت گری کا بازار گرم کر رکھا تھا، اس معرکہ میں میدان برقوق کے ہاتھ رہا تھا، اسلیے وہ عدو تیمور نہیں بلکہ منطاش تھا[1]،

یہ ادعیہ اور اذکار کی کتاب ہے، ابن الجزریؒ نے حدیث کی چھبیس مستند اور صحیح کتابوں سے انتخاب کرکے تالیف کی ہے، اور ہر ماخذ کا بطور علامت مختصر بھی ساتھ ساتھ لکھ دیا ہے،

کتاب میں صحت کا بڑا خیال رکھا ہے، چنانچہ خود لکھتے ہیں:-

اخرجتہ من الاحادیث الصحیحۃ	میں نے صحیح حدیثوں سے اس کتاب کو مرتب کیا ہے،

یہ انتخاب ایسا جامع ہے کہ کوئی صحیح حدیث چھوٹنے نہیں پائی ہے، جیسا کہ خود مرتب کا بیان ہے:

مع اقتصارہ واختصارہ لعلہ لایدع	باوجودیکہ یہ کتاب چھوٹی اور مختصر ہے، مگر
حدیثاً صحیحاً فی بابہ الا استقصاہ	اپنے باب کی کوئی صحیح حدیث چھوٹنے
واتی بہ	نہیں پائی ہے.

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی دعاؤں کو اس کتاب میں اس جامعیت سے یکجا کیا گیا ہے کہ اس موضوع پر بڑی سے بڑی کتاب میں بھی مفقود ہے،

قد جمع بحمد اللہ تعالیٰ ہذا المختصر	الحمد للہ یہ مختصر مجموعہ ان تمام حدیثوں کا جامع ہے
اللطیف ما لم یجمعہ مجلدات من التالیف	جس سے بڑی بڑی تالیفات بھی خالی ہیں،

---

[1] ملاحظہ ہو النجوم الزاہرہ طبع دار المعارف المصریہ ج ۱۱ ص ۳۵۵ (حوادث ۷۹۱ھ) نیز انسائیکلوپیڈیا آف اسلام (برقوق) ۱/۱ The Mameluke or Slave Dynasty of Egypt by W. Muir. London 1896 P. 111

یہ کتاب کیا ہے؟ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی پوری زندگی کا بولتا ہوا مرقع ہے،

ان دعاؤں میں نبوت کا نور، پیغمبر کا یقین اور عبد کامل کی نیازمندی اور اطاعت ہے، ان کا فقرہ فقرہ دریائے رحمت کو جوش میں لانے کے لیے کافی ہے، ان میں درد بھی ہے اور دوا بھی، انسان کی درماندگی کا اظہار بھی ہے، اور خدا کی عظمت اور جبروت کا اعتراف بھی، سادگی اور خلوص بھی ہے، قبولیت اور تاثیر بھی، دل کی تڑپ بھی ہے اور سکون قلب بھی، اختصار بھی ہے اور جامعیت بھی، اس میں ان تمام چیزوں کا ذکر ہے جن کی انسان کو مہد سے لحد تک ضرورت پیش آتی ہے، دنیا اور آخرت کی ہر ضرورت کا تذکرہ ہے، یہ پیغمبروں کی صداؤں کا مجموعہ ہے، جو بھی یہ صدا لگاتا ہے اس کی صدا خالی نہیں جاتی، خوش قسمت ہیں وہ لوگ جن کی زبانیں ان صداؤں سے تر رہتی ہیں،

اس کتاب کی تمام دعائیں ایک مسلمان کو یاد ہونی چاہئیں، اگر سب نہ ہوسکیں تو کم از کم وہ دعائیں تو ضرور یاد ہونی چاہئیں جو کسی وقت اور سبب کے ساتھ مخصوص نہیں ہیں، اور کتاب کے آخر میں درج ہیں،

ہندوستان کے سرخیل جماعت اہل حدیث نواب صدیق حسن خاں قنوجی اس کی صحت اور قبولیت کا اعتراف ان الفاظ میں کرتے ہیں:

"این کتاب جامع اوراد و ادعیہ و اذکار ہر باب است و در وے ذکر کردہ کہ اخراج او را بہ احادیث صحیح نمودہ است"[1]

آگے رقمطراز ہیں:

"این کتاب از روز تالیف تا این دم شرقاً و غرباً در ورد اہل علم و فضل است

---

[1] اتحاف النبلاء، ص ۶۷

و تاثیر وے بر ہمگنان ظاہر"

ان ادعیہ کی صحت اور صداقت آج بھی عالم آشکارا ہے، محدث شوکانی نے "تحفۃ الذاکرین" میں اس قسم کے متعدد واقعات لکھے ہیں، جس سے اس کی صداقت اور صحت میں کوئی شبہ نہیں رہتا۔

نامور محدثین کا اس کتاب کی شرحیں لکھنا بھی اس کی صحت اور قبولیت کی نہایت واضح دلیل ہے، ان شارحین میں اہل دل بھی ہیں اور زاہدانِ خشک بھی، ان شروح میں ملا علی قاری کی شرح الحرز الثمین بہت مشہور ہے، جو مکہ معظمہ سے ۱۳۰۲ھ میں شائع ہوئی ہے، ہندستان میں اس کی متعدد شرحیں فارسی زبان میں لکھی گئیں، اور اردو زبان میں سب سے پہلے نواب قطب الدین خاں دہلوی[1] نے نہایت جامع شرح لکھی ہے، جو ظفر جلیل کے نام سے مشہور ہے، یہ نام حکیم خیر اللہ مرحوم کا تجویز کردہ ہے، جو خیر کے باعث دائم و قائم ہے، اس میں شارح نے

---

[1] محمد قطب الدین بن محمد محی الدین احراری نام تھا، ۱۲۱۹ھ میں دہلی میں پیدا ہوئے، علوم عقلیہ اور نقلیہ کی تحصیل دہلی کے ارباب کمال سے کی، حدیث شاہ محمد اسحاق دہلوی سے پڑھی، اور دہلی ہی میں تمام عمر حدیث کا درس دیتے رہے، ۱۲۸۹ھ میں مکہ معظمہ میں وفات پائی، بہت سے رسالے اردو زبان میں رفاہ عام کے لیے لکھے، بعض اہم کتابوں کے اردو میں ترجمے بھی کیے، جن میں مظاہر حق اور ظفر جلیل بہت مشہور ہیں، مزید حالات کے لیے ملاحظہ ہو: آثار الصنادید مؤلفہ سرسید احمد مطبع نولکشور ۱۸۷۶ء / ۱۲۹۳ھ باب چہارم ص ۹۰، میر المحتشم از نواب محمد غوث خاں والی جاورہ، مطبع سرکاری ریاست جاورہ ۱۳۰۵ھ / ۱۸۸۸ء ص ۶۲۵، حدائق الحنفیہ تالیف فقیر محمد جہلمی، مطبع نولکشور لکھنؤ ۱۹۰۶ء، تذکرۂ علمائے ہند مؤلفہ رحمان علی طبع نولکشور ۱۹۱۴ء ص ۱۶۹، الحیات بعد الممات از فضل حسین مطبع اکبری آگرہ ۱۳۳۲ھ ص ۴۱ و ۴۷، ۷۲ تا ۷۶، ارواح ثلاثہ، مرتبہ ظہور الحسن، یونین پریس دہلی ۱۳۷۰ھ ص ۲۶۸، بہادر شاہ ظفر کا روزنامچہ ص ۸۵

ہر دعا کا سلیس اور مطلب خیز ترجمہ کیا اور جا بجا مفید اور ضروری قواعد کا اضافہ کیا ہے، شرح مکمل کرنے کے بعد حرفاً حرفاً شاہ محمد اسحاق کو سنائی اور انھوں نے بہت پسند فرمائی۔

ظفر جلیل کی زبان نہایت قدیم ہے، اور انداز بیان میں بھی کوئی جاذبیت نہیں، مگر اس میں بڑی سادگی اور خلوص ہے، اور یہی اس کی قبولیت کی بڑی دلیل ہے۔

یہ کتاب سب سے پہلے ۵ رجمادی الاخری ۱۲۵۸ھ میں مولوی محمد حسین کے زیر اہتمام بڑی تقطیع پر مطبع دہلی اخبار سے شائع ہوئی ہے، میرے والد محمد عبد الرحیم خاطر قدس سرہ العزیز کے کتب خانہ میں یہی نسخہ تھا، جو الحمد للہ احقر کے پاس ہے، اس نسخہ کی یہ خصوصیت ہے کہ اس میں فوائد کو حواشی کتاب میں درج کیا ہے، اور خاتمۃ الکتاب پر باب الرقاق کا اضافہ کیا جو مشکوٰۃ سے منقول ہے اور کم و بیش سو صفحات پر مشتمل ہے، یہ نسخے سال ڈیڑھ سال میں بک گئے، اور شائقین کی طلب باقی رہی تو مصطفیٰ خاں المتوفی ۱۲۶۹ھ نے اپنے مطبع مصطفائی لکھنؤ سے ۱۲۶۰ھ میں نہایت آب و تاب سے شائع کیا، مگر اس سے باب الرقاق خارج کر دیا، یہ نسخے بھی دو تین برس میں فروخت ہو گئے، تو عبد الرحمن بن محمد صالح نے ۱۲۶۴ھ میں اس نسخہ کی نقل اپنے مطبع رحمانی بمبئی سے شائع کی، پھر ۱۲۸۸ھ میں مطبع بدر الدجیٰ اور ۱۳۱۰ھ میں مطبع افتخار دہلی سے شائع ہوئی۔

ظفر جلیل کی زبان پرانی تھی، مولانا محمد احسن نانوتوی نے اس کی زبان بدل کر اس کو از سر نو زندگی بخشی اور اس کا نام ظفر جلیل رکھا، اور تاریخی نام خیر متین تجویز کیا اور یہی نام کتاب پر چھپا اور مشہور ہوا۔

حصن حصین کا ایک ترجمہ ظہیر الیقین، شاہ ظہیر احمد ظہیری سہسوانی کے نام سے لاہور سے شائع ہوا ہے، یہ ترجمہ بامحاورہ، رواں اور چست ہے، مگر ترجمہ ہی ترجمہ ہے، تشریحی فوائد سے یکسر خالی ہے، اس کے علاوہ اردو میں حصن حصین کا انتخاب بھی کہف المتین کے نام سے شائع ہو چکا ہے، عدۃ الحصن الحصین یہ بھی الحصن الحصین کا مختصر ہے، نواب صدیق حسن خاں قنوجی کے ایما سے مولوی عبد المجید دہلوی کے

زیر اہتمام ۱۳۰۶ھ میں پہلی بار مطبع انصاری دہلی سے شائع ہوا ہے

یہ الحصن الحصین کی بڑی اچھی تلخیص ہے، ابن الجزریؒ نے یہ احباب کے اصرار سے لکھی تھی، آغاز کتاب میں لکھتے ہیں:

حدانی علی اختصارہ فی ھٰذہ	مجھے ان اوراق میں حصن حصین کی تلخیص
الاوراق من اصلہ المذکور	پر ایک ایسے شخص کے بر سہا برس کے
بعد ان کنت سئلت عن ذالک	اصرار نے آمادہ کیا، جس نے میری
مرارا فی سنین وشھور ممن	بے چینی کو دور کیا، اور میری غربت
اٰنس غربتی وکشف کربتی	کو موانست بخشی، حق تعالیٰ نے مجھ پر
فاوجب الحق علی مکافاتہ	اس کا بدلہ ضروری قرار دیا، میں بدلہ
ولم اقدر علیھا الا بالدعا	میں بجز دعا کے اور کچھ نہیں کرسکتا،
فاسأل اللّٰہ تعالیٰ نصرہ	لہذا بارگاہ الٰہی میں دست بدعا ہوں
ومعافاتہ	کہ خدایا اس کی مدد اور نصرت فرما،
ملیک علی الدنیا بطلعۃ وجہہ	وہ اپنے رخ روشن سے دنیا کا بادشاہ ہے،
جمال واجلال وعز موئد	اس میں جلال بھی ہے، جمال بھی، اور عزت
فتی ما سمعنا قبلہ کان مثلہ	اور شوکت بھی، وہ ایسا جوان ہے کہ
ولا بعدہ واللّٰہ یبقیہ مو جلا	جس کے جیسا جوان نہ اس سے پہلے سنا
	اور نہ دیکھا اور نہ آگے دیکھ سکتے اور
	سن سکتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ اس نور اور
	کو دائم اور قائم رکھے،

یہ کتاب دس بابوں پر مشتمل ہے، متوسط تقطیع کے ۴۴ صفحات پر محیط ہے

ابن الجزریؒ کا یہ مختصر بھی بہت مقبول ہوا، صاحب کشف الظنون کا بیان ہے:

"۸۲۶ھ میں ہرات میں سید اصیل الدین عبد اللہ بن عبد الرحمٰن الحسینی نے اس کا فارسی میں ترجمہ کیا اور بعض اہم امور کا اضافہ بھی کیا جو پانچ فصلوں اور ایک خاتمہ پر مشتمل ہے۔"[۱]

متاخرین علما میں محدث محمد بن علی شوکانی نے اس کی نہایت جامع اور مفید شرح لکھی ہے، جس کا نام تحفۃ الذاکرین بعدۃ الحصن الحصین ہے، یہ شرح محدثانہ رنگ میں منفرد اور بہت سے فوائد کی جامع ہے، محمد بن محمد زبارہ کی تعلیقات کے ساتھ مصر سے دو مرتبہ شائع ہو چکی ہے۔

(۲۵) مفتاح الحصن الحصین: یہ الحصن الحصین کی نہایت مفید اور مختصر شرح ہے، جس میں ابن الجزریؒ نے مشکل الفاظ کی تشریح اور مغلقات کی توضیح کی ہے، یہ الحصن الحصین کی تالیف کے چالیس سال بعد شیراز میں تالیف کی اور رمضان ۷۹۱ھ میں اس کی تکمیل سے فراغت پائی، وہ وعدہ جو الحصن الحصین کے دیباچہ میں کیا تھا اب پورا کیا۔[۲]

(۲۶) عقد اللآلی فی الاحادیث المسلسلۃ العوالی: اس میں دینی مسلسلات کو بیان کیا ہے، شعبان ۸۰۵ھ/۱۴۰۳ء میں شیراز میں تالیف کی تھی۔[۳]

(۲۷) غایۃ المنی فی زیارۃ منی: اس میں منیٰ کے فضائل مذکور ہیں۔[۴]

(۲۸) فضل حرا: یہ غار حرا کے فضائل میں ہے۔[۵]

۱؎ کشف الظنون، جلد ۱ کالم ۶۷۰ ۲؎ ایضاً جلد ۱ کالم ۶۶۹ ۳؎ انسائیکلوپیڈیا آف اسلام

۴؎ الضوء اللامع ۵؎ ایضاً

(۲۹) اصول حدیث۔ البدایہ فی علوم الروایہ: یہ کتاب علوم حدیث اور اصول حدیث میں ہے۔[۱]

(۳۰-۳۱) تذکرۃ العلماء: یہ کتاب بھی اصول حدیث میں ہے، اور التوضیح فی شرح المصابیح کا مقدمہ ہے، جب آپ کا تیمور کے ساتھ کش میں قیام ہوا تھا، اس وقت آپنے مصابیح کی شرح توضیح کے نام سے لکھی، اس میں جب مصطلحات فن کا ذکر آیا، اور رومیوں کو اس کے سمجھنے میں کچھ دقت ہوئی تو انھوں نے مصطلحات فن پر جداگانہ کتاب لکھنے کی درخواست کی، اس سے پیشتر آپ الہدایہ الی معالم الروایہ لکھ چکے تھے، مگر وہ منظوم تھی، اور اس میں ایجاز تھا، رومیوں کی درخواست پر آپ نے مصطلحات حدیث پر ایک جداگانہ رسالہ لکھا، اور اس میں حدیث کے مصطلحات اور اصول حدیث کو نہایت تفصیل سے ذکر کیا، جو طریقہ ابن الاثیر الجزری نے جامع الاصول کے مقدمہ میں اختیار کیا، وہی طریقہ آپنے بھی اس میں اختیار کیا ہے، یہ ۸۰۶ھ کی تالیف ہے، چونکہ یہ التوضیح کا مقدمہ ہے، اسلیے المقدمہ فی علم الحدیث کے نام سے بھی مشہور ہے، آپ کے فرزند ابو بکر احمد الجزری نے اس کی شرح بھی لکھی ہے۔[۲]

(۳۲) الہدایہ الی علوم الدرایہ[۳] - یہ اصول حدیث میں ایک منظوم رسالہ ہے جو ۴۱۰ شعروں پر مشتمل ہے، شیخ تقی الدین حسین بن علی بن عبد الرحمن الحصنی نے ۹۵۹ھ میں العنایہ کے نام سے اس کی ایک مبسوط شرح بھی لکھی ہے۔

---

[۱] المصعد الاحمد فی ختم مسند احمد ص ۵۳ [۲] کشف الظنون ج ۱ کالم ۳۸۹۔ [۳] انسائیکلوپیڈیا آف اسلام [۳] انسائیکلوپیڈیا آف اسلام میں اس کا نام الہدایہ علم معالم الروایہ لکھا ہے، مگر صاحب کشف الظنون نے اس کا نام الہدایہ الی علوم الدرایہ ذکر کیا ہے، ملاحظہ ہو کشف الظنون ج ۲ کالم ۲۰۲۸

فقہ: (۳۳) الابانہ فی العمرۃ من الجعرانہ[۱] | التکریم فی العمرۃ من التنعیم } ان دونوں رسالوں میں جعرانہ اور تنعیم سے عمرہ کے احرام باندھنے پر فقہی نقطۂ نگاہ سے بحث کی گئی ہے۔

اصول فقہ: (۳۳) شرح التحصیل - یہ امام فخر الدین رازی کی کتاب المحصول کی تلخیص التحصیل لمخصلہ محمود بن ابی بکر الارموی المتوفی ۶۸۲ھ کی تین جلدوں میں نہایت مبسوط شرح ہے۔[۲]

(۳۴) شرح منہاج الوصول الی علم الاصول - یہ علامہ بیضاوی کی کتاب منہاج الوصول کی شرح ہے، جو آپنے زندگی کے آخری ایام میں تالیف کی تھی، چنانچہ آغاز کتاب میں اپنے بڑھاپے اور بے بسی کا بھی تذکرہ کیا ہے۔[۳]

سیرت: (۳۵) التعریف بالمولد الشریف - یہ کتاب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت اور بیان ولادت میں ہے اور ایک مقدمہ اور دو بابوں پر مشتمل ہے۔[۴]

(۳۶) ذات الشفا فی سیرۃ المصطفیٰ ومن بعدہ من الخلفاء - یہ رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت اور مصنف کے زمانہ تک خلفاء کے حالات میں ایک منظوم کتاب ہے، جو آپ نے سلطان بایزید عثمان کی فرمائش پر ۲۵ ذی الحجہ ۷۹۸ھ مطابق ۳۰ ستمبر ۱۳۹۶ء میں تالیف کی تھی۔[۵]

(۳۷) عرف التعریف - یہ التعریف بالمولد الشریف کا خلاصہ ہے، جس میں صرف سیرۃ النبی صلی اللہ علیہ وسلم کو اختصار کے ساتھ بیان کیا ہے، حاجی خلیفہ کا بیان ہے،

---

[۱] ایضاح المکنون فی الذیل علی کشف الظنون مؤلفہ اسمٰعیل پاشا، طبع استنبول ۱۹۴۵ء ج ۱ کالم ۳ میں اسکا نام الابانہ فی العمرہ من الجوانہ درج ہی، ظاہر ہو کہ یہ طباعت کی غلطی ہی، صحیح لفظ من الجعرانہ ہی۔ [۲] کشف الظنون ج ۲ کالم ۱۶۱۵ [۳] ایضاً کالم ۱۸۷۹، [۴] ایضاً جلد ۱ کالم ۴۲۱، انسائیکلوپیڈیا آف اسلام میں اسی کتاب کو غالباً المولد الکبیر کے نام سے درج کیا ہے (al- Mawlid al Kbir) [۵] کشف الظنون ج ۱ کالم ۱۱۳۲

یہ انتہائی اختصار کے باوجود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے تمام احوال اور وقائع پر حاوی ہے، ایک مقالہ اور دو مقصدوں پر مشتمل ہے، ملا حسین واعظ کاشفی نے نہایت وضاحت کے ساتھ اس کا فارسی میں ترجمہ بھی کیا ہے[۱]"

(۳۸) اسنی المطالب فی مناقب علی بن ابی طالب۔ یہ حضرت علیؓ کے فضائل و مناقب کے بیان میں ہے، اور مصر سے شائع ہو گئی ہے،

(۳۹) تاریخ رجال: تاریخ ابن الجزری۔ یہ شمس الاسلام ذہبی کا مختصر ہے، ۷۹۸ھ میں اس کی تالیف سے فراغت پائی تھی، حاجی خلیفہ نے تصریح کی ہے،

"ہو غیر الطبقات، یہ کتاب طبقات القراء کے علاوہ ہے[۲]"

(۴۰) غایۃ النہایۃ فی القراء۔ اس کا پورا نام غایۃ النہایۃ فی اسماء رجال القراءات اولی الروایۃ والدرایۃ ہے، اس کی ترتیب حروف معجم پر ہے، اور طبقات الصغریٰ کے نام سے زیادہ مشہور ہے، یہ دراصل نہایۃ الدرایات کا مختصر ہے، جو موصوف نے ۷۹۵ھ میں کیا تھا، مستشرق برجستراسر (Bergstraesser) نے مطبعۃ السعادۃ قاہرہ سے ۱۳۵۱ھ/۱۹۳۲ء میں اس کو دو ضخیم جلدوں میں شائع کیا،

غایۃ النہایہ کا اختصار مولف کے تلمیذ عبد الرزاق بن حمزۃ الحنفی الطرابلسی نے بھی کیا تھا، جس کا نام نہایۃ الغایۃ فی بعض اسماء رجال القراءات اولی الروایۃ والدرایہ رکھا تھا، اس کو ۷۷۵ھ کے اوائل میں شروع کیا، اور ۱۲ رجب سنہ مذکور کو مکمل کیا، اس کا ایک مخطوطہ دار الکتب المصریہ میں موجود ہے[۳]۔

(۴۱) نہایۃ الدرایات فی اسماء رجال القراءات۔ یہ کتاب طبقات الکبریٰ کے نام سے بھی

۱؎ کشف الظنون ج ۲ کالم ۱۱۳۲ ۲؎ ایضاً کالم ۲۹۵ و ۲۷۷ ۳؎ فہرس الکتب العربیہ لدار الکتب المصریہ طبع قاہرہ ۱۹۴۲ء ج ۵ ۴؎ ملحق ثانی علم التاریخ ص ۲۷۱

مشہور ہے، اس علامہ دانی اور شمس الدین ذہبی کی کتابوں کو جو اسی موضوع پر تھیں، یکجا ہی نہیں کیا ہے، بلکہ اپنی بیش بہا معلومات کا جابجا اضافہ کیا ہے، اور بہت سے لوگوں کا مستقل تذکرہ بھی لکھا ہے، مورخ سخاوی کا بیان ہے،

اخذ ابن الجزری کتاب للذہبی وضم الیہ زیادات کثیرۃ فی التراجم وتراجم مستقلۃ وکتبت علیہ ذیلا حافلا[۱]	ابن الجزری نے ذہبی کی کتاب کو اصل قرار دیکر اس کے تراجم رجال میں بیش بہا معلومات کا اضافہ کیا اور بہت سے لوگوں کا مستقل اور جداگانہ تذکرہ بھی لکھا ہے، اور میں نے اس پر ایک نہایت جامع ذیل لکھا ہے۔

طاش کبری زادہ کا بیان ہے۔

لا اجمع ولا انفع من طبقات الشیخ الجزری[۲]	طبقات القراء میں ابن الجزریؒ کی طبقات القراء سے زیادہ نافع اور جامع کوئی کتاب نہیں ہے،

حاجی خلیفہ لکھتے ہیں:

ھو اجمع الکتب فی ھذا النوع[۳]	اس موضوع پر یہ کتاب سب کتابوں سے زیادہ جامع ہے

(۴۲) المسند الاحمد فیما یتعلق بمسند احمد۔ اس میں مسند احمد کی اہمیت اور دخول مسند فی مسند سے بحث کی ہے،[۴]

(۴۳) المصعد الاحمد فی ختم مسند۔ ربیع الاول ۸۲۸ھ میں مسجد الحرام کے اندر جب مسند احمد ختم کرائی تھی، اس وقت یہ رسالہ سپرد قلم کیا تھا، یہ متوسط تقطیع کے ۲۰ صفحات پر مشتمل ہے، احمد محمد شاکر نے مسند احمد کی پہلی جلد کیساتھ دار المعارف المصریہ سے چھپوا کر شائع کر دیا ہے، اس میں اپنی سند کو بیان کیا ہے، اور جن شیوخ کا نام آیا ہے ان کے حالات اور تحصیل سند کی کیفیت وہ

۱؎ الاعلان بالتوبیخ لمن ذم التاریخ مؤلفہ سخاوی مطبعۃ الترقی دمشق ۱۳۴۹ھ ص ۱۰۲ ۲؎ مفتاح السعادۃ ج ۱ ص ۲۳۳ ۳؎ کشف الظنون ج ۲ کالم ۱۱۰۵ ۴؎ المصعد الاحمد ص ۱۳ و ایضاح المکنون ج ۲ کالم ۴۸۱

امام احمد کا مختصر اور جامع تذکرہ ہے۔

(۴۴) المصعد الاحمد فی رجال مسند احمد۔ یہ کتاب رواۃ مسند کی جرح و تعدیل اور اس کے رجال کے حالات میں ہے، ابن الجزریؒ کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ اس موضوع پر یہ نہایت مبسوط کتاب تھی، اس کا کچھ حصہ کسی فتنہ میں ضائع ہوگیا تھا جس کو دوبارہ مختصر لکھکر کتاب کے ساتھ شامل کر دیا، اس میں ان رواۃ کا اضافہ ہے جو آپ کے شیخ ابوبکر ابن المحب سے چھوٹ گئے تھے۔[۱]

(۴۵) هداية المهرة فی ذکر الائمة العشرة المشتهرة۔ یہ ائمہ قرأت عشرہ کے حالات میں ہے۔[۲]

معانی وبیان (۴۶) حاشیۃ الایضاح۔ یہ علامہ جلال الدین محمد بن عبدالرحمٰن القزوینی المتوفی ۷۳۹ھ کی تالیف الایضاح فی المعانی والبیان پر آپ کا حاشیہ ہے۔[۳]

نحو (۴۶) الجواهرة العلية فی علم العربية۔ یہ علم نحو میں ہے۔[۴]

پند وموعظت (۴۷) الزهر الفائح فی ذکر من تنزه من الذنوب والقبائح۔ یہ کتاب متوسط تقطیع کے ۴۰ صفحات پر مشتمل ہے اور مصر سے کئی مرتبہ شائع ہو چکی ہے،

(۴۸) مختار النصیحة بالادلة الصحیحة۔ اس میں احادیث کی روشنی میں اخلاقی امور پر بحث کی گئی ہے۔[۵]

(۴۹) الاصابة فی لوازم الخطابة۔ یہ کتاب فن خطاطی پر ہے۔[۶]

۱؎ المصعد الاحمد ص ۴۰ ۲؎ کشف الظنون ج ۲ کالم ۲۰۴۲ ۳؎ ایضاً ج ۱ کالم ۲۱۱

۴؎ الضوء اللامع اور البدر الطالع

۵؎ انسائیکلوپیڈیا آف اسلام ۶؎ ایضاً

مطبوعات جدیدہ

مقدمہ تفسیر نظام القرآن اور اقسام القرآن } تالیف مولانا حمید الدین فراہی رحمۃ اللہ علیہ مترجمہ مولانا امین احسن اصلاحی تقطیع چھوٹی ضخامت ۹۰ اور ۱۴۳ صفحات، کاغذ، کتابت وطباعت بہتر، قیمت بالترتیب ۵/۷ نئے پیسے اور ۱۲/۳، پتہ: دائرۂ حمیدیہ، مدرسۃ الاصلاح، سرائے میر، ضلع اعظم گڈھ۔

کلام مجید کے فہم اور مشکلات قرآنی کے حل میں اللہ تعالیٰ نے مولانا حمید الدین فراہی رحمۃ اللہ علیہ کو خاص ملکہ عطا فرمایا تھا، اور اس حیثیت سے وہ اس دور کے صحیح معنوں میں ترجمان القرآن تھے، مشکلات قرآنی کے سلسلے میں دو اہم مسائل مفسرین کے سامنے آتے ہیں، ایک یہ کہ کلام مجید کی آیات میں بظاہر باہم کوئی ربط اور نظم نہیں ہے، چنانچہ مفسرین کا ایک طبقہ اسی کا قائل ہے، اس کے نزدیک یہ کوئی نقص وعیب نہیں ہے، اس کا کہنا ہے کہ کلام مجید جیسی کتاب میں جو گوناگوں مضامین اور مسائل پر مشتمل ہو اور جس کا نزول بتدریج ایک طویل مدت میں ہوا ہو، نظم و ترتیب قدرۃً نہیں ہو سکتی اور نہ اس کی ضرورت ہے، لیکن ایک طبقہ ربط آیات کا قائل ہے، وہ کہتا ہے کہ بے ربطی اور بے ترتیبی معمولی کلام کے لیے بھی نقص ہے نہ کہ اللہ تعالیٰ کا کلام جو افصح الکلام بھی ہے، اس کے لیے تو ربط اور نظم و ترتیب اور بھی ضروری ہے، چنانچہ اس خیال کے علماء و مفسرین نے آیات قرآنی کے ربط پر کتابیں بھی لکھی ہیں، مولانا حمید الدینؒ بھی اسی آخری گروہ میں تھے، بلکہ نظم قرآنی ان کا خاص موضوع تھا، اور اس کے فکر و تدبر میں انھوں نے عمر کا بڑا حصہ صرف کیا تھا، دوسرا مشکل مسئلہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے

کلام مجید میں جا بجا معمولی معمولی مخلوقات کی قسمیں کھائی ہیں، اور قسم کھانا بجائے خود ناپسندیدہ فعل ہے، چنانچہ خود کلام مجید میں اس کی مذمت ہے، قسم کھانے کے معنی یہ ہیں کہ قسم کھانے والا اپنے کو حقیر سمجھتا ہے، جو اللہ تعالیٰ کی عظمت کے منافی ہے، پھر کلام مجید میں توحید و رسالت اور حشر و نشر وغیرہ جیسی اہم چیزوں کے ثبوت کے لیے قسم کھائی گئی ہے، اور مخالف کے لیے محض قسم سے کوئی چیز ثابت نہیں ہوتی، اس لیے قسم کھانا عبث ہے، اس کے علاوہ قسم بڑی باعظمت چیزوں کی کھائی جاتی ہے، اور کلام مجید میں معمولی مخلوقات کی قسمیں کھائی گئی ہیں، مفسرین نے ان اعتراضوں کے مختلف جوابات دیے ہیں، لیکن ان میں سے کوئی بھی تشفی بخش نہیں ہے، مولانا حمید الدین رحمۃ اللہ علیہ نے ان دونوں مسائل پر مستقل رسالے عربی میں لکھے تھے، مذکورۂ بالا کتابیں ان ہی کا اردو ترجمہ ہیں، ان دونوں رسالوں خصوصاً اقسام القرآن کے مباحث اسقدر عالمانہ اور دقیق ہیں کہ تبصرہ سے ان کی خوبی کا اندازہ نہیں ہو سکتا، اس کیلیے ان کا مطالعہ ضروری ہے، پہلے رسالہ میں ربط آیات کے بارہ میں علماء و مفسرین کے خیالات اور ان کی کوششیں نقل کی گئی ہیں، اس کے بعد آیات قرآنی کے سمجھنے کے کلی اصول بیان کیے گئے ہیں، جن کی روشنی میں فکر و تدبر سے آیات کا ربط ظاہر ہو جاتا ہے، دوسری کتاب میں بھی پہلے قرآن مجید کی قسموں کے بارہ میں دوسرے مفسرین کے نقطۂ نظر اور ان کی توجیہوں پر تبصرہ کیا گیا ہے، اس کے بعد عرب کے جاہلی کلام، قسم کی تاریخ، اس کی حقیقت، غرض و غایت، ان کی قسموں اور آیات قرآنی کی روشنی میں ثابت کیا گیا ہے کہ قرآن مجید کی قسمیں درحقیقت ان مشہور معنوں میں قسم ہی نہیں ہیں، جس کو عرف عام میں قسم سمجھا جاتا ہے، بلکہ ان کی حیثیت شواہد و استدلال کی ہے، اس بحث میں ان تمام اعتراضات کا جواب آگیا ہے جو قرآن مجید کی قسموں کے بارے میں کیے جاتے ہیں، یہ ان دونوں کتابوں کے مباحث کا خلاصہ اور لب لباب ہے، باقی اس کی تفصیل اور اصل خوبی و دلنشینی کا اندازہ کتاب کے مطالعہ ہی سے ہو سکتا ہے، ترجمہ نہایت سلیس و رواں ہے، یہ کتاب اپنے موضوع اور مباحث کے لحاظ سے اصحاب علم کے مطالعہ کے لائق ہے،

حالی کا ذہنی ارتقاء از جناب ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خاں صاحب، صدر شعبۂ اردو، سندھ یونیورسٹی، تقطیع چھوٹی، ضخامت ۳۰۰ صفحات، کاغذ، کتابت و طباعت بہتر، قیمت مجلد للعہ، پتہ: اعلیٰ کتب خانہ ناظم آباد نمبر ۳ کراچی

یہ کتاب فاضل مصنف کے ان مضامین کا مجموعہ ہے، جو انھوں نے مولانا حالی کے مختلف پہلوؤں پر لکھے اور مختلف رسالوں میں شائع ہو چکے ہیں، اس میں چار مضامین ہیں، حالی کا ذہنی ارتقاء، حالی کی اردو غزل، سرسید اور مقدمۂ شعر و شاعری، اور حالی کی فارسی شاعری، پہلا مضمون بہت مبسوط ہے اور مستقل کتاب کی حیثیت رکھتا ہے، اس میں مولانا حالی کے مضامین، ان کے مکاتیب اور نظم و نثر سے اس طرح ان کے حالات تحریر کیے گئے ہیں جس سے ان کے سوانح کے ساتھ ساتھ ان کے خیالات میں تدریجی ارتقا اور ان کے علمی و ادبی اور اصلاحی خدمات کی پوری تفصیل سامنے آجاتی ہے، اور یہ معلوم ہو جاتا ہے کہ سرسید کے اثر سے ان کے خیالات میں کیا تغیر ہوا، اور اس کا اثر ان کی نظم و نثر پر کیا پڑا، اس سلسلہ میں ان کے پورے تحریری ذخیرہ کا خواہ وہ نظم ہو یا نثر جائزہ آگیا ہے، پھر اسی نقطۂ نظر سے ان کی اردو غزل اور مقدمۂ شعر و شاعری کا جائزہ لیا گیا ہے، اور آخر میں انکی فارسی شاعری پر تبصرہ ہے، اس طرح اس میں حالی کے خیالات اور ان کے کارناموں کی پوری تفصیل آگئی ہے، اس کے جملہ مضامین مصنف کی محنت، تلاش و جستجو اور دقت نظر کے شاہد ہیں،

آئینۂ دلدار ۔ مؤلفہ جناب ابرار علی صاحب صدیقی، تقطیع چھوٹی، ضخامت ۲۰۵ صفحات، کاغذ، کتابت و طباعت بہتر، مجلد، قیمت تحریر نہیں، پتہ: افسر بک ڈپو نظامی روڈ، ہنٹر لائن جیکب لائن متصل پرانی نمائش کراچی،

مولانا شاہ محمد دلدار علی المتخلص بہ مذاق، المتوفی ۱۸۹۵ء بدایوں کے ایک قدیم تاریخی خانوادہ کے عالم باعمل بزرگ اور صاحب نسبت صوفی تھے، ہندوستان کے تمام مروجہ سلاسل میں ان کو خلافت

واجازت حاصل تھی، شاعر بھی تھے، ذوق سے تلمذ تھا، اور اس دور کے بہت سے اکابر سے ان کے تعلقات تھے، بدایوں، اس کے اطراف اور مالوہ میں ان کے روحانی اور ادبی فیوض کا سلسلہ عرصہ تک جاری رہا، چنانچہ ان مقامات میں ان کے مریدین اور خلفار کی بڑی تعداد تھی، انکے احفاد میں ایک نوجوان ابرار علی صاحب نے ان کے حالات میں مذکورۂ بالا کتاب لکھی ہے، اس میں مولانا شاہ محمد ولدا علی کے خاندان، ان کے علمی کمالات، سلوک ومعرفت، ارشاد وہدایت، خلفا، ومریدین اور تلامذہ واحباب کی تفصیل ہے، اسکے بعد ان کے نام ان کے معاصرین کے خطوط ہیں، ان میں مولانا فیض الحسن سہارنپوری، مرزا غالب، مولوی باقر علی دہلوی، مفتی صدر الدین آزردہ، مولانا عبدالحق خیرآبادی، مولوی محمد حسین آزاد اور امیر مینائی کے نام قابل ذکر ہیں، پھر صاحب سوانح کے شاعرانہ کمالات اور ادبی تصانیف کا تذکرہ مختلف اصناف سخن میں کلام کے نمونے اور کلام کا انتخاب ہے، آخر میں ان تمام سلاسل کا تفصیلی شجرہ ہے جن میں ان کو اجازت حاصل تھی، مگر تصوف وسلوک کے سلسلہ میں صحیح تصوف اور ارشاد وہدایت کے بجائے کشف وکرامات کا تذکرہ زیادہ ہے، تاہم جو لوگ صوفیانہ مذاق رکھتے ہوں، انکے مطالعہ کے لائق ہے،

کلمات اکابر۔ مرتبہ جناب مولانا محمد اسحٰق بنارسی، تقطیع اوسط، ضخامت ۱۲۷ صفحات، کاغذ، کتابت وطباعت بہتر، قیمت مجلد عمر، پتہ (۱) مولانا محمد اسحٰق، کچی باغ بنارس، (۲) کریم منزل فلیٹ نمبر ۱ پٹن روڈ بمبئی،

اس کتاب میں مولف نے کلام مجید، احادیث نبوی، صحابۂ کرام، تابعین عظام اور دوسرے صلحار واخیار کے سبق آموز کلمات طیبات اور اخلاقی وحکیمانہ اقوال وملفوظات جمع کیے ہیں، جن سے دین ودنیا دونوں میں ہدایت ورہنمائی حاصل ہوتی ہے، جن بزرگوں کے اقوال نقل کیے گئے ہیں، ان کا مختصر تعارف بھی کرا دیا گیا ہے، کتاب مفید اور سبق آموز ہے،

"م"

جلد ۸۱ ماہ رجب المرجب ۱۳۷۷ھ مطابق ماہ فروری ۱۹۵۸ء نمبر ۲

مضامین